OPEN ACCESS: Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
ISSN (ONLINE): 2707-1219 & ISSN (PRINT): 2707-1200
http://www.arjish.com

قدیم مصر پائیدار ترقی کا شاہکار: سورۃ یوسف کی روشنی میں

Ancient Egypt, A Masterpiece of Sustainable Development: In the Light of Surah Yusuf

Anas Mehmood
PhD scholar department of comparative religion and Islamic culture University of Sindh Jamshoro.

Dr. Jabeen Bhutto
Assistant professor department of comparative religion and Islamic culture University of Sindh jamshoro.

Received on: 05-04-2024 Accepted on: 10-05-2024

Abstract

This study examines the correlation between the reforms implemented by Prophet Yusuf and the emergence of sustainable development practices in ancient Egypt. Employing a historical research methodology, the investigation delves into primary and secondary sources to analyze the socio-economic and environmental conditions of the era. The research contends that while Prophet Yusuf's leadership and divine guidance were instrumental in fostering stability, economic prosperity, and social justice, these factors alone do not fully account for Egypt's enduring sustainability. Rather, a complex interplay of geographical, cultural, and technological elements contributed to Egypt's remarkable achievements. By scrutinizing the evidence, this study seeks to provide a nuanced perspective on the relationship between religious leadership, societal structures, and environmental stewardship in shaping the trajectory of ancient Egyptian civilization.

Keywords: Ancient Egypt, Surah Yusuf, Prophet Yusuf, Egyptian civilization.

1 ابتدائیہ

بنیادی طور پر ملک مصر کی تقسیم دو حصوں میں کی جاتی ہے جن میں سے پہلے حصے کو بالائی مصر جب کہ دوسرے کو زیریں مصر کہا جاتا تھا۔ کیتھلینکیو پر نے قدیم مصر کی اس تقسیم کے متعلق لکھا ہے کہ ثقافتی اور جغرافیائی لحاظ سے ابتدائی مصر کو زیریں اور بالائی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ دریائے نیل کے ڈیلٹا کے جنوب میں واقع سارا خطہ بالائی مصر کہلاتا ہے۔ اس خطے میں واقع پہاڑوں سے دریائے نیل نکل کر شمال کی جانب بہتا ہے جب کہ زیریں مصر کا علاقہ زیادہ تر نشیبی ہے جہاں دریائے نیل بحر روم میں جا کر ایک خالی پنکھے کی شکل بناتا ہوا گر جاتا ہے۔ بالائی مصر کے لوگ اپنی سرزمین کی طرح تند خو اور متشدد ہوتے ہیں جس طرح سے ان کے گھر ہیں جب کہ نچلے علاقوں کے لوگوں میں زیادہ تر خوش حال کسان ہیں۔[1]

ابتداء میں مصر مختلف حصوں میں تقسیم شدہ علاقہ تھا مگر پھر یہ علاقہ ایک بادشاہ نے اپنے زیر انتظام کر لیا جس کے بعد یہاں مختلف مداخلت کار حملہ کر کے اسے فتح کر لیتے اور بعض علاقوں پر قبضہ کر کے علاقے کی زمینوں اور افراد کو مغلوب کر لیتے تھے۔ پھر ان مداخلت کاروں پر کوئی اور حملہ آور ہو جاتا اور وہ اپنی ہمت، طاقت اور بساط کے مطابق مختلف علاقوں پر قبضہ قائم کر کے حکمرانی بنالیتا۔ اس پرانے دور میں مصر کا خطہ کئی اضلاع میں تقسیم تھا جن کے حکمران بھی الگ الگ ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جس میں سے ایک شمالی جب کہ دوسرا جنوبی حصہ کہلایا۔ ان دونوں حصوں کے بادشاہ بھی الگ الگ ہوا کرتے تھے لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا کہ دونوں ہی ایک فرمانروا کے ماتحت ہو گئے۔[2] اے آر ڈیوڈ (A. R. David) نے قاہرہ شہر سے متصل قدیم مصر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ

"South-west of Cairo, the modern capital of Egypt, on the west side of the Nile, there liesthe province of Fayoum, the largest of the country's oases, which owes itsremarkablefertility both to springs of water, and to the Bahr Yusef, a channelthrough which the watersof the Nile flow into the famous lake of the oasis, knowntoday as the 'Birket ElQarun'……A small temple adjoined the pyramid on the east,and half a mile distant onthe edge of the desert lay another temple, also part of the original pyramid complex. Northof the larger temple was situated the town of the pyramid workmen, known today as 'Kahun'."[3]

ان کی عبارت کا یہ مفہوم نکلتا ہے کہ دریائے نیل کے مغرب میں مصر کا موجودہ دارالحکومت قاہرہ کے جنوبی مغربی طرف ملک کا سب سے بڑا نخلستان واقع ہے جس کے پانی کے چشموں کی زرخیری قابل ذکر ہے۔ یہاں یوسف نامی ایک چھوٹی نہر بھی ہے جو دریائے نیل کے پانی کو مصر کی معروف جھیل ''برکۃ القرآن'' تک پہنچاتی ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا مندر بھی موجود ہے جو مشرق سے متصل اور آدھا میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسی صحرا میں ایک اور مندر بھی ہے جو اہرام کمپلیکس کا ایک حصہ ہے جب کہ اس بڑے مندر کے شمالی طرف اہرام میں کام کرنے والے کارکنوں کا قصبہ ہے جسے کاہون کہتے ہیں۔ اس قصبے کاہون پر بھی مختلف حوالوں سے بہت سی تحقیقات ہوئی ہیں کیونکہ یہ بھی مصری تہذیب کا شاہکار ہے۔ بابائے تاریخ ''ہیروڈٹس'' نے چار سو قبل مسیح میں جب مصر کی سیر کی تو اس نے اپنی آنکھوں دیکھا تمام حال اپنی کتاب میں لکھا جس کا نام ''دنیا کی قدیم ترین تاریخ'' ہے۔ اس نے اس کتاب میں مقامی افراد اور علاقائی پجاریوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی مختلف آرا بھی لکھی ہیں۔ وہ قدیم مصر کے حوالے سے لکھتا ہے کہ یہاں کی مٹی جھر جھری اور کالی سی ہے کیونکہ یہاں کثرت سے سیلاب آتے ہیں اور ایتھوپیا سے آنے والے دریاؤں کی مٹی یہاں تک پہنچ جاتی ہے۔[4]

قدیم مصر کی حد بندی کرتے ہوئے کیتھرینبرڈ لکھتی ہیں کہ وادی نیل کی نچلی سرزمین کو قدیم مصر کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی بہت بڑا خطہ نہیں ہے بلکہ چھوٹا سا ہے۔ دریائے نیل کے مغرب سے لیبیا کی سرحد اور صحرا سے بحر احمر کی سرحد سے متصل نیل کے مشرق میں اور جزیرہ نما سینا میں جا کر مصر کی سرحد اسرائیل کی سرحدوں سے جا ملتی ہیں۔[5] ہیروڈٹس نے قدیم مصر کی طویل ساحلی سرحد کی خشکی اور لمبائی کے بارے میں لکھا ہے کہ مصر کی ساحلی سرحد تقریباً چھتیس سو فرلانگ لمبی ہے۔ نیز ساحلی علاقے سے لے کر ہیلوپولس تک مصر کا علاقہ خاصا چوڑا ہے اور یہ

علاقہ زیادہ تر ہموار، دلدلوں سے بھرا ہوا اور چشموں سے خالی ہے۔[6] جبکہ دور حاضر کے جدید مصر کا جغرافیائی، ماحولیاتی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام زمانہ قدیم کے مصر سے یکسر مختلف ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں ہونے والی ماحولیاتی، سیاسی و تمدنی اور معاشرتی و معاشی تبدیلیاں ہیں۔ اس متعلق سید سراج لکھتے ہیں کہ

"مصر افریقہ کے شمالی افریقہ کونے میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں سینائے کا ریگستان، شمال میں بحیرہ روم، مغرب میں لیبیا اور جنوب میں سوڈان اور حبشہ واقع ہیں۔ برفانی عہدوں کے اختتام کے بعد شمالی افریقہ کی جغرافیائی حالات آج کل کے بہ نسبت بالکل مختلف تھے۔ گرم آب و ہوا کے ساتھ ساتھ بارش کی کثرت بھی تھی۔ سارا جنگلات سے پٹا ہوا تھا۔ شکاری جانوروں کی افراط تھی لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد عالمگیر جغرافیائی تبدیلیوں کی وجہ سے بارش میں کمی ہو گئی اور جنگلات آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے اور یہ سرسبز علاقہ ریگستان میں تبدیل ہو گیا۔ جانور جنوب کے جنگلوں میں بھاگ گئے۔ اب صرف دریائے نیل ہی مصر کے باشندوں کی زندگیوں کا سہارا رہ گیا۔"[7]

2 قدیم مصر اور لفظ فرعون

2۔1 فرعون لفظ کی تحقیق

قدیم مصر کے بادشاہوں کو ''فرعون'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور قدیم مصر کی مسند اقتدار پر براجمان ہونے والا ہر بادشاہ اسی لقب کے ساتھ تخت نشین ہوتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لقب مصر کے بادشاہوں کے لیے ہی خاص رہا ہے تاہم اس لقب کی وجہ سے سب سے زیادہ مشہور وہ فرعون ہوا جو حضرت موسیٰؑ کا معاصر تھا اور اس نے اپنی بادشاہت کی بنیاد پر زمین پر خدا ہونے کا دعوی قائم کر دیا تھا۔[8] لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو جہاں ایک طرف فرعون کا لفظ مصر کے بادشاہوں کے لیے وارد ہوا ہے تو وہیں یہ لفظ، ظالم، سرکش، متکبر، مغرور، نافرمان اور باغیوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ فرعون کی جمع ''فراعین'' ہے۔[9]

مختلف اردو لغات میں فرعون لفظ کے ساتھ جڑا منفی تاثر اور معنی اس وجہ سے بھی ہیں کہ قدیم مصر کے بادشاہ ان فرعونوں کے کارنامے تاریخ میں بہت زیادہ اچھے نہیں رہے ہیں جس کی وجہ ان کے ساتھ کے ساتھ ان معانی کو جوڑ دیا گیا تاہم لغات کی کتب میں فرعون لفظ کے ساتھ ان معانی کو منسلک کرنا ایک تسامح ہی ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ لفظ فرعون (Pharaoh) کا لفظی معنی ''عظیم مکان'' ہوتا تھا کیونکہ اپنے بادشاہوں کے محلات کے لیے قدیم مصر کے لوگ ''فرعون'' لفظ استعمال کرتے تھے تاہم اٹھارہویں سلطنت (۱۳۰۷-۱۵۵۰ قبل مسیح) کے قیام کے بعد ہر بادشاہ اپنے لیے یہ لقب اختیار کرنے لگا۔ اسی وجہ سے بائبل میں بھی مصر کے بادشاہوں کے لیے لفظ فرعون ہی وارد ہوا ہے۔[10]

2۔2 قدیم مصر اور مذہب

مصر کے قدیم باشندوں کی روزمرہ کی زندگی میں مذہبی اقدار کو بہت زیادہ عمل دخل حاصل تھا۔ قدیم مصری مذہب بنیادی طور پر مختلف عقائد اور رسومات کا مجموعہ تھا جس میں آج مصری افسانوں، سائنس، طب، نفسیات، جادو، روحانیت، مذہبی تفہیم کے ساتھ ساتھ مرنے کے بعد کی

زندگی پر یقین شامل تھا۔ مذہب نے مصریوں کی زندگی کے ہر پہلو پر اپنا کردار ادا کیا کیونکہ اس حیاتِ ارضی کو وہ لوگ ابدی سفر کا محض ایک ابتدائی حصہ سمجھتے تھے۔ وہ ایسی زندگی گزارنے کو ضروری سمجھتے تھے جسے مرنے کے بعد تسلسل سے قائم رکھا جا سکے۔ اس زمین پر رہتے ہوئے ہر شخص یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ یہاں دوسروں سے ایسی ہم آہنگی رکھے گا کہ اس کی ذات کسی دوسرے کی زندگی اور اس کائنات کے نظام کو متاثر کرنے کا سبب نہیں بنے گی۔ معاشرتی توازن برقرار رکھنے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر انحصار کرتے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ دیوتاؤں کی مرضی و منشا یہی ہے۔ قدیم مصری مذہب کا بنیادی اصول ہیکا(heka) کے نام سے معروف تھا جسے مصری آرٹ میں دیوتا کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے۔ مصری ہیکا کے وجود کو ابدی تسلیم کرتے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس کائنات کی تخلیق کے وقت بھی اس کا وجود موجود تھا۔ وہ جادو اور طب کا دیوتا مانا جاتا تھا مگر اس کے علاوہ وہ ایسی طاقت بھی تھا جس نے دیوتاؤں کو اپنے افعال سرانجام دینے کے قابل بنایا اور انسانوں کو اجازت دی کہ وہ بھی دیوتاؤں سے بات کر سکیں۔ وہ ہمہ جہت اور ہمہ گیر دیوتا کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جو مصریوں کی روزمرہ کی زندگیوں کو جادو سے تبدیل کرتا تھا۔[11]

قدیم مصری دیوتاؤں کی پرستش کیا کرتے تھے اور انہیں اپنی زندگیوں میں بہت زیادہ اہمیت دیا کرتے تھے۔ مصر کی تین ہزار سالہ تاریخ مختلف دیوتاؤں کے وجود سے بھری پڑی ہے جن میں کچھ وقت کے ساتھ ختم ہو گئے۔ ماہر مصریات نے لکھا ہے کہ

"Religion played an important role in ancient Egypt. The polytheistic Egyptians worshipped a wide array of gods and goddesses. Over the course of 3,000 years, new deities appeared, and many old ones faded in importance. Yet Egyptian religion remained remarkably stable over that time and pervaded daily life." [12]

"قدیم مصر میں مذہب کا کردار نہایت اہم تھا۔ مصریوں نے دیوتاؤں کی ایک کثیر تعداد کی پوجا کی ہے۔ تین ہزار سالوں کے دوران بہت سے نئے دیوتا ظاہر ہوئے اور پرانے دیوتاؤں کی اہمیت کم ہو گئی تاہم اس کے باوجود مصری مذہب لوگوں کی روزمرہ زندگی میں بہت زیادہ مستحکم رہا۔"

مصر کے لوگ اپنی دیوی دیوتاؤں کو مضبوط اور خوبصورت پتھروں اور مٹی کے ساتھ نہایت مہارت اور عمدگی کے ساتھ تراشا کرتے تھے۔ دیوتاؤں کی مورتیوں کی تنصیب عام طور پر اونچی جگہ پر کی جاتی تھی تاکہ ان کے سامنے آسانی سے مذہبی رسومات اور قربانیاں پیش کی جا سکیں۔

"حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل پتھر اور ستون قابل احترام تصور کیے جاتے تھے۔ پتھروں اور ستونوں کے محور پر مذہبی تقریبات اور قربانیاں ادا کی جاتی تھیں۔ ان کو انسانی شکل میں ڈھال کر بت بنائے جاتے تھے اور انہیں بلندیوں پر نصب کیا جاتا تھا۔ وہ ان سے خوف بھی محسوس کرتے تھے کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ ان میں ارواح قیام کرتی ہیں۔"[13]

دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرنا اور ان کے آگے قربانیاں اور چڑھاوے چڑھانے کی روایت مصریوں میں نسل در نسل چلتی رہی تھی۔ اسی وجہ

سے قدیم مصر کی تہذیب میں ان گنت دیوی دیوتاؤں کی موجودگی اور ان کے شواہد ملتے ہیں۔

2۔2۔1 دیوتاؤں کا تصور

قدیم مصر کے لوگ بنیادی طور پر بت پرست اور مشرک تھے اور بے شمار دیوی دیوتاؤں پر ایمان و ایقان رکھتے تھے۔ ہر علاقے، گاؤں اور خاندانوں کے دیوتا الگ الگ ہوتے تھے جن کی پوجا کی جاتی تھی۔ اگر کوئی شخص اپنا علاقہ چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں منتقل ہوتا تو اسے اپنے مقامی دیوتا کو اسی جگہ چھوڑ کر جانا پڑتا اور جس نئی جگہ وہ منتقل ہوتا تو وہاں اسے نئے دیوتا کی پوجا کرنی ہوتی تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے لکھا ہے کہ

"مصری بت پرست تھے۔۔۔اور بہت سے دیوتا پوجتے تھے۔ ہر شہر بلکہ ہر گاؤں کا دیوتا الگ تھا اور وہاں صرف اسی کو پوجا جاتا تھا۔ وہی آبادی کا بچانے والا مانا جاتا تھا۔ جب کوئی آدمی اپنے گاؤں یا شہر سے چلا جاتا تھا تو اپنے دیوتا کو بھی چھوڑ جاتا تھا اور نئی جگہ کے دیوتا کی پوجا کرنے لگتا تھا کیونکہ سمجھتا تھا کہ اب دوسرے دیوتا کی عمل داری میں آگیا ہے اور یہی دیوتا کام آسکتا ہے۔ چنانچہ ممفس کا دیوتا فتاح تھا اور عین شمس کا اتوم تھا۔ تھتھو تحد کا خنوم تھا اور تھیبس کا امن۔"[14]

مصر کے لوگ اپنے دیوی دیوتاؤں سے حد درجہ والہانہ عقیدت و محبت رکھتے تھے اور اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی، قربت اور رضا حاصل کرنے کے لیے بے بس جانوروں کی مانند کام کیا کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس پوری کائنات کا نظام یہ دیوتا مل کر چلا رہے ہیں اور اگر ان دیوتاؤں نے انہیں چھوڑ دیا تو انہیں اس کائنات میں جگہ نہیں ملے گی۔[15]

2۔2۔2 وحدانیت کا تصور

قدیم مر کے لوگ بیک وقت متعدد دیوتاؤں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، ان کے دیوتاؤں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب اہل مصر کوئی نیا دیوتا مانتے تو گزشتہ دیوتا کی وقعت و اہمیت خود بخود کم ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ پرانے دیوتا کو چھوڑ کر اپنے نئے دیوتا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کے سامنے طرح طرح کے چڑھاوے اور قربانیاں کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ جب ان کی عقیدوں میں وحدانیت کی جانب رجحان شروع ہوا اور انہوں نے اپنے معبودوں کو دیگر معبودوں میں ضم کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح سے وہ بہت سے معبودوں کا ظہور ایک ہی ہستی میں مانا کرتے تھے۔ جیسا کہ امون دیوتا ان کی زندگیوں میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا مگر انہوں نے اسے ''رے'' دیوتا کے ساتھ ضم کر دیا چنانچہ نیا دیوتا امون-رے ہو گیا جس میں بیک وقت امون اور رے کی طاقت و قوت موجود تھی۔[16] وحدانیت کے اس طرح کے تصورات نے مصریوں کے عقائد و نظریات میں جدت پیدا کیا اور آہستہ آہستہ وہ ایک معبود کی پرستش کی جانب راغب ہوئے۔ جے آر۔ رائے نے لکھا ہے کہ

"روایات کی رو سے سب سے بڑا دیوتا رامانا جاتا تھا جسے وہ قائم بالذات اور خالق ارض و سما مانتے تھے۔ اس کی قدرت اس کی ذات میں پنہاں تھی جس کا کسی کو کچھ علم نہ تھا مگر کائنات کے اندر اس کے پوشیدہ نام سے آشکارا تھا۔ گو ان میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو ایک معبود کی

عبادت کے قائل تھے جسے وہ ازلی وابدی خالق جہاں مانتے تھے۔ خدا یا دیوتا مصری زبان کا نتر یا نتھر تھا مگر پند و نصائح کی کتابوں میں اس سے ایسے معنی منسوب ہیں جیسے عربی میں ''اللہ'' کے لیے جاتے ہیں۔''[17]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کے لوگ قدیم دور میں بہت سے دیوتاؤں اور معبودوں کی پرستش کرتے تھے تاہم وقت کے تغیر کے ساتھ انہوں نے اپنے عقائد میں بھی کافی تبدیلیاں کر لیں۔ اگرچہ وہ کسی حد تک توحید کی طرف مائل تھے مگر ان کا تصور توحید بھی شرک سے خالی نہیں تھا۔ اخناتون نامی فرعون نے سب مصریوں میں ایک مشترکہ معبود ''اتون'' متعارف کروایا تھا اور سرکاری سطح پر اس کی عبادت کو مذہبی رسومات و لوازمات میں شامل کیا تاہم اخناتون کی موت کے ساتھ ہی اس کا یہ دیوتا اور مذہب بھی ختم ہو گیا۔[18]

3 قدیم مصر کا سماجی و معاشرتی ڈھانچہ

قدیم مصری معاشرے کو درجہ بندی میں تقسیم کیا گیا تھا جس میں سب سے اوپر فرعون مصر کا رتبہ ہوا کرتا تھا۔ فرعون کے بعد اس کا وزیر، پھر دربار کے دیگر اراکین، کاہن، قاضی اور علاقائی گورنر (جنہیں نومارچ کہا جاتا تھا) فوجی جرنیل، آرٹسٹ، ہنر مند افراد، حکومت کی جانب سے مقررہ نگران، کسان اور آخر میں غلاموں کی معاشرتی ترتیب کے لحاظ سے رکھا جاتا تھا۔[19]

اس معاشرتی ترتیب کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کا تعین دیوتاؤں کی جانب سے کیا گیا ہے۔ قدیم مصری معاشرے میں ایک قدر مآت (ma'at) تھی جسے آج کل ہم آہنگی اور مساوات کہا جا سکتا ہے۔ اس قدر کے مطابق یہ معاشرتی تقسیم ایک آفاقی قانون تھا جسے دیوتاؤں نے مرتب کر کے لوگوں کو اجازت دی تھی کہ وہ اب کاروبار دنیا میں شریک ہو سکتے ہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دیوتاؤں نے انہیں ان کی ضرورت کے بقدر سب کچھ عطا کر کے انہیں بہترین اور زرخیز زمین میں پیدا کیا ہے اور اپنے اور ہمارے درمیان ثالثی کا کردار ادا کرنے کے لیے فرعون مصر کو اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ فرعون وقت کی بنیادی ذمہ داری یہی تھی کہ وہ معاشرتی ہم آہنگی اور مساوات کو برقرار رکھے تاہم ایک بادشاہ کی حیثیت سے ایک فرعون ہر معاشرتی پہلو کی نگرانی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ نگرانی کے مقصد کے لیے ابتدائی خاندان کے عہد (۳۱۵۰-۲۶۱۳ ق م) میں ایک عہدہ بنایا گیا۔ یہ وزیر درباری کے دیگر اراکین کے ذمہ مختلف کام لگاتا، کاتبوں کے ذریعے پیغام رسانی کا کام لیتا، فوج اور علاقائی گورنروں کے معاملات کی نگرانی، عوامی فلاحی منصوبوں کی نگرانی اور محصول کی وصول جیسے بہت سے امور سرانجام دیتا تھا۔[20]

اس درجہ بندی کا سب سے نچلا طبقہ غلاموں کا تھا جن کی بڑی تعداد ان سابقہ آزاد افراد پر مشتمل تھی جنہیں میدان جنگ سے پکڑ کر غلام بنایا گیا تھا یا پھر قرض کی ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں قرض خواہ نے انہیں غلام بنا لیا تھا۔ قدیم مصر میں غلام لاکھوں کی تعداد میں ہوا کرتے تھے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رعمسیس سوم نے نذرانے کے طور پر ایک لاکھ تیرہ ہزار غلام مندروں میں دیئے تھے۔[21] ان غلاموں سے اوپر کسانوں کا طبقہ تھا جو ملک کی کل آبادی کا تقریباً اسی فیصد تھے اور یہی وہ طبقہ تھا جس کی بدولت مصر کی تہذیب تین ہزار سال تک زندہ، مستحکم اور پھلتی پھولتی رہی مگر اس کے باوجود اس طبقہ کی محنت پر زیادہ حق ریاست، مذہبی اشرافیہ اور جاگیرداروں کو حاصل تھا

کیونکہ زمین کی ملکیت کا حق انہی کے پاس تھا۔ یہ کسان کھیتوں میں محنت مزدوری کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کو محصول بھی ادا کرتے اور نہری نظام پر بغیر کسی اجرت کے کام بھی کرتے تھے۔[22] ہنر مند اور دست کار افراد کی حالت ان کسانوں کے بالمقابل کچھ بہتر تھی مگر وہ بھی ریاستی اختیار سے بالا دست نہیں تھے۔ مندروں سے متصل جو بازار ہوا کرتے تھے، یہ دست کار ان بازاروں میں کام کرتے اور ان کی تنخواہوں کی ادائیگی سرکاری خزانے سے کی جاتی۔ کاتب (منشی) اور دیگر سرکاری ملازمین کا تعلق اعلی طبقے سے تھا اور یہ بڑے جبے جیسا سفید لباس زیب تن کیا کرتے تھے جس سے ان کا اعلی سرکاری منصب ظاہر ہوتا تھا۔[23]

1_3 تفریحی مشاغل

قدیم مصر میں طبقہ اشرافیہ نے اپنی سماجی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے کھیل کود اور تفریح کا انتظام بھی کر رکھا تھا اور وہ مکمل طور پر اس سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے تاہم معاشرے کے غریبوں اور کمزوروں کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اس کھیل کود اور تفریحی پروگرام میں شریک ہو سکیں۔ یہ لوگ اپنی تفریحی محافل میں گانا بجانے کا خوب اہتمام کیا کرتے تھے کیونکہ ان کی گھٹی میں گانا بجانا موجود تھا اور مرد و زن کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی تھی جو گانے بجانے کے کام سے ہی وابستہ تھی۔[24] گانے بجانے کے علاوہ بھی وہ ہر قسم کے سامان لہو و لعب میں مستغرق تھے جس کے متعلق جے آر رائے لکھتے ہیں کہ

"اہل مصر اپنے مشاغل اور سامان لہو و لعب، معاشرت اور تمدنی فنون میں زمانہ حال کے لوگوں سے جنہیں اپنی تمدنی ترقی پر اس قدر ناز ہے، کسی طرح کم نہ تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اتنے وسیع عرصے میں فطرت انسانی میں کوئی نمایاں فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ انسان جیسا اس وقت تھا، اب بھی ویسا ہی ہے۔"[25]

قدیم مصر میں حکام اور طبقہ اشرافیہ نے بے شمار تفریحی مشاغل پال رکھے تھے جن میں ایک خاص تفریحی مصروفیت ''شکار'' تھا۔ وہ لوگ '' جنگی جانوروں'' اور ''مچھلی'' کے شکار سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ شکار کھیلنا ان کے بہترین تفریحی مشاغل میں شامل تھا یہاں تک کہ فرعون مصر بھی شکار پر جایا کرتا تھا۔ تتمس سوم نامی ایک مشہور فرعون نے ۱۰۲ خوف ناک شیر، ۱۲۰ بد مست ہاتھی اور ۹۶ دیگر جنگی جانوروں کا شکار کیا تھا۔[26]

2_3 علم طب اور مصری

مصر کی آب و ہوا اہل مصر کے لیے بہت زیادہ سازگار نہیں رہی ہے جس کی وجہ سے ان میں بہت سے طبّی مسائل تھے۔ دریائے نیل کے قریب رہنے کی وجہ سے انہیں ملیریا اور جگر و آنتوں کے متعدد امراض کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نیل میں مگرمچھ اور دریائے گھوڑے کی موجودگی بھی ہمیشہ ان کے لیے سر درد کا باعث رہی تھی۔ کسان اور مزدور طبقہ دن بھر کھیتی باڑی اور مزدوری کرنے کی وجہ سے ریڑھ کی ہڈی اور جوڑوں کے درد میں مبتلا رہتا تھا جب کہ تعمیراتی کاموں اور جنگی مہمات میں لگنے والی چوٹیں ان کے جسم پر گہرے زخم ثبت کر جاتی تھیں۔ غریب لوگ کنکر اور ریت ملا آٹا کھاتے تھے جس کی وجہ سے ان کے دانت ختم ہو جاتے اور مسوڑھوں پر پھوڑے نکل آتے۔ دولت مندوں

کی پر تعیش خوراکوں نے انہیں بھی بہت سے امراض میں مبتلا کر رکھا تھا۔[27] قدیم مصری آرٹ میں امیر طبقے کی جو منظر کشی کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ خوراک کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے۔ بالغ مرد پنتیس سال جب کہ بالغ خواتین ۳۰ سال تک ہی جی پاتی تھیں کیونکہ آبادی کا ایک تہائی حصہ کم عمری میں ہی مر جاتا تھا۔[28] اسی سبب سے مشرق وسطی میں مصری معالجین کی طبّی مہارت کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت تھی جیسا کہ مشہور مصری فرعون امنہوتب اس وجہ سے مرنے کے بعد بھی کافی عرصہ تک مشہور رہا۔[29] مصری طبیب نہایت اعلی پائے کی تشخیص کرنے کے ماہر ہوتے تھے اور ان میں سر، پیٹ، دانتوں سمیت جملہ امراض کے طبیب موجود تھے۔ انفیکشن سے بچنے کے لیے وہ زخموں کا علاج کچے گوشت، سفید کپڑے، جالیوں اور شہد میں جھاڑیوں کو ڈبو کو مرہم پٹی کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کیا کرتے تھے۔[30] جب کہ درد دور کرنے کے لیے جنگلی پودینہ، افیون اور بیلاڈونا استعمال کرتے۔ وہ لوگ جو آگ میں جھلس کر زخمی ہو جاتے تو ان کے زخموں کے علاج کے لیے مرہم کی تیاری میں عورت کا دودھ استعمال کیا جاتا تھا۔ علاج معالجے کے ساتھ دیوی دیوتاؤں کی دعائیں لینا لازمی تھا۔[31]

اپنی طبّی مہارت کی وجہ سے وہ انسانی جسم کو ایک طویل مدت تک محفوظ کرنے کی قدرت بھی رکھتے تھے حالانکہ انسانی جسم نہایت نرم و نازک ہوتا ہے اور جلد ہی گل سڑ جاتا ہے مگر اس کے باوجود قدیم مصری اسے صدیوں تک محفوظ رکھنے کی طبّی صلاحیت رکھتے تھے۔ لاش کو محفوظ کرنے کا یہ عمل ''عمل حنوط''(mummification) کہلاتا تھا۔ اس عمل میں مردے کے نتھنوں میں چمٹا داخل کر کے خاص طریقے سے مغز نکالا جاتا اور پھر تیز دھار پتھر کے پیٹ چاک کر کے انتڑیاں نکالی جاتیں۔ اس کے بعد شکم کو کھجور کی شراب سے دھو کر اس میں خوشبو دار چیزیں بھر دی جاتیں اور پھر باریک لیپ کر کے اس چیر کے نشان کو بھی بند کر دیا جاتا۔ مختلف مصالحے لگانے کے بعد لاش کو ستر دن کے لیے سوکھنے رکھ دیا جاتا اور پھر بعد میں نکال کر اسے غسل دے کر اس پر چادر اور پٹیاں لپیٹ دی جاتیں۔ وہ لوگ جو اس سارے عمل کا خرچہ برداشت کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے تو ان کے مردوں کی انتڑیاں نکالے بغیر ہی پیٹ میں ہلکا تیزاب ڈال کر لاش کو سوکھنے رکھ دیا جاتا جس کے بعد تیزاب کی تاثیر سے اس کی انتڑیاں گل جاتیں اور گوشت بھی جھڑنا شروع ہو جاتا تھا۔ کچھ وقت میں جب یہ ڈھانچہ رہ جاتا تو ورثاء کے حوالے کر دیا جاتا جسے لے جا کر وہ تابوت میں بند کر کے دفن کر دیتے۔[32] انسانی جسم کو حنوط کرنے کی وجہ سے مصر کے لوگ جسم کے اندرونی اعضا کا آپریشن کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں جسم انسانی اور سرجری کے حوالے سے بہت زیادہ معلومات دستیاب تھیں۔[33] تاہم ان کی سرجری مردوں تک ہی محدود تھی۔ زندہ انسانوں کا علاج وہ بغیر سرجری کے ہی کیا کرتے تھے۔

"Egyptian physician-priests had been mummifying human bodies for thousands ofyears. But because they looked at corpses as religious, not scientific, things, they still hadvery little knowledge about human anatomy. Their goal was to preserve the body, not tounderstand it."[34]

"مصری معالج ہزاروں سالوں سے انسانی جسموں کو حنوط کر رہے تھے لیکن وہ انسانی جسم کو سائنٹیفک طریقے کے بجائے مذہبی نظر سے دیکھتے

تھے۔ان کے پاس جسم انسانی کی اناٹومی کے بارے میں کم معلومات تھیں کیونکہ ان کا مقصد جسم انسانی کو سمجھنا نہیں بلکہ اسے بچانااور محفوظ کرنا تھا۔"

3۔3 علوم وفنون میں مصریوں کی مہارت

قدیم مصر میں علوم وفنون کی بڑی اہمیت تھی اور لاکھوں لوگ فنی صلاحیتوں کے حامل تھے جن کے بنائے گئے فن پارے پانچ ہزار سال بعد بھی سالم حالت میں حوادث زمانہ کے باوجود محفوظ ہیں۔ان میں پتھروں پر تحریر کنندہ کرنا، پتھروں کو تراشنا،اہراموں کی تعمیر اور لاشوں کو حنوط کرنے جیسے بے مثال فنون شامل ہیں جن کی وجہ سے قدیم مصر کی سنگ تراشی، صنعت، فن تعمیر اور فن پاروں کی جاذبیت ودلکشی آج تک باقی ہے۔ مصری تہذیب کی اسی انفرادیت کے سبب سے ماہرین علوم مصریات کا ایک گروہ طویل مدت سے آثار قدیمہ پر تحقیقات کرنے میں مصروف ہے۔ان لوگوں کی انتھک محنت کے نتیجے میں قدیم مصر کے حالات پر بڑی حد تک روشنی ڈالی جاسکتی ہے کیونکہ کئی مقامات پر کھدائی کے کام کے نتیجے میں قدیم مصر کے حوالے سے دستیاب معلومات میں بڑی پیش رفت ہوئی ہے اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ان کھدائیوں کے نتیجے میں قدیم مصر کا فن سنگ تراشی، فن صناعی، فن تعمیر اور عظیم الشان تہذیب وتمدن ریت کی تہ سے نکل کر دنیا کی نظروں کے سامنے آیا ہے۔ان کھدائیوں میں جو مقبرے دریافت ہوئے ہیں،ان میں بہت سی رنگین تصاویر موجود ہیں جن میں بادشاہوں کے کارناموں کی عکس بندی کی گئی ہے۔اس کے علاوہ ان تصاویر میں قدیم دور کی مصری زندگی کے مختلف پہلوؤں کو منقش کیا گیا ہے۔ان تصاویر کا رنگ ایسا ہے کہ گویا حال ہی میں یہ بنائی گئی ہیں۔[35] کھدائیوں کے نتیجے میں نکلنے والے قدیم مصر کے آثار قدیمہ نے دنیا کو حیران کر دیا ہے کہ قدیم دور میں مصریوں نے ایسی کاریگری کا مظاہرہ کیا جس کی مثال دور جدید میں بھی نہیں پیش کی جاسکتی ہے۔ مصریوں کی اسی انفرادی خوبی کے متعلق محققین لکھتے ہیں کہ

"The ancient Egyptians were a very civilized nation and had many achievements to their name, including monumental buildings and extensive trade networks. They were a very busy society – constantly improving and progressing in their lifestyle and technology. While the Greeks are attributed with most academic, scientific, and philosophical achievements, evidence shows that the Egyptians were not lacking in these departments; they just had a different approach. Everything the ancient Egyptians did had a practical purpose. They did not believe in researching for research's sake or contemplating unusable theories. Theirs was a practical rather than academic society."[36]

"قدیم مصری ایک بہت مہذب قوم تھی اور ان کے نام بہت سی کامیابیاں منسوب ہیں جن میں یادگار عمارتیں اور وسیع بنیادوں پر تجارتی جال شامل ہے۔ وہ ایک مصروف معاشرہ تھا باوجود یہ کہ عموماً یونانیوں کو زیادہ تر علمی، سائنسی اور فلسفیانہ کامیابیوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مصری ان شعبوں میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں رکھتے تھے تاہم ان کا انداز تھوڑا مختلف تھا۔ قدیم مصریوں کی ہر شے کا

ایک عملی مقصد ہوا کرتا تھا اور وہ تحقیق کی خاطر تحقیق کرنے یا ناقابل استعمال نظریات پر غور کرنے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ علمی معاشرے کے بجائے وہ عملی مظاہرے پر زیادہ رجحان رکھتے تھے۔"

4-3 قدیم مصر کا فن تحریر

قدیم مصر کی زبان آثار قدیمہ کے ماہرین کو بادشاہوں کے مقبروں اور اہراموں میں لکھی ہوئی ملی ہے۔ اس دور کے مصری رسم الخط کو ہیئرو فلیفس کہا جاتا ہے جسے تحریر کے بجائے تصویری انداز میں لکھا جاتا تھا۔[37] دنیا میں کئی تہذیبیں آئی اور گئیں جن کی زبانیں بھی تہذیب کے ساتھ ختم ہو گئی اور آج لوگ ان سے واقف نہیں ہیں چنانچہ اسی طرح سے قدیم مصر کی زبان بھی اس تہذیب کے ساتھ ہی معدوم و متروک ہو چکی تھی تاہم آثار قدیمہ میں ملنے والی قدیم تحاریر نے ایک بار پھر اس زبان کو محققین میں زندہ کر دیا۔ یہ زبان دو قسم کی ہے جن میں ایک تصویری ہے اور دوسرا تصویری اسکرپٹ ہے۔[38]

جب یہ تحریر دریافت ہوئی تو اسے پڑھا جانا ناممکنات میں سے تھا مگر ایک فرانسیسی ماہر مصریات نے اس مشکل کام کا بیڑہ اٹھایا اور مصری زبان کو ڈی کوڈ کیا جس کے بعد قدیم مصری تہذیب کے پوشیدہ راز دنیا کے سامنے ظاہر ہونا شروع ہوئے۔[39] یہ تحریر بھی مصریوں کا ایک شاہ کار فن تھا کیونکہ جب دنیا کے کسی اور خطے میں تصویری رسم الخط نہیں پایا جاتا مگر مصریوں نے نہ صرف اسے ایجاد کیا بلکہ اس کے ذریعے مقبروں، مندروں اور اہراموں میں اس زمانے کے متعلق تمام معلومات لکھیں۔[40]

مصر کے تمام لوگ پڑھنے لکھنے کے فن سے آشنا نہیں تھے مگر آثار قدیمہ میں نکلنے والے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ تھے۔ قدیم مصری تحریر کا نظام ۱۸۲۲ قبل مسیح تک وجود میں آچکا تھا جس کے بعد مصریوں نے اپنی تاریخ کو مختلف عمارتوں میں لکھنا شروع کیا۔[41]

4-3-1 قدیم مصر کا فن ادب

کسی بھی تہذیب کے جمالیاتی پہلو اور اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے والی شے اس کا علم ادب ہے۔ قدیم مصری تہذیب کا علم ادب دریائے نیل اور متعدد دیوتاؤں کے گرد گھومتا ہے جن کا ان کی روزمرہ کی زندگیوں سے گہرا تعلق تھا۔ قدیم مصر کی شاعری میں اہل مصر کا دریائے نیل سے تعلق اور لگاؤ ظاہر ہوتی ہے کہ نیل اور مصریوں کے عشق کو دریا کی طغیانی اور خوفناک مگرمچھوں کی موجودگی بھی نہیں روک سکتی ہے۔[42]

قدیم مصر میں مذہبی رسومات ادا کرنے کی ذمہ داری کاہنوں کے سپرد تھی جو ان رسومات کی ادائیگی کے دوران مختلف مذہبی گیت، نظمیں اور رمزیہ اشعار پڑھا کرتے تھے جن میں دیوتاؤں کی تعریف کی جاتی۔ انہی اشعار کو مردوں کے تابوتوں پر بھی کندہ کیا جاتا تھا اور یہ کام کرنے والے ماہر کاہن ہوا کرتے تھے۔ مصری مندروں میں ہر روز صبح کے وقت بھجن گائے جاتے اور تہواروں کے دوران دیوتاؤں کے مجسموں کے سامنے شاعری پڑھی جاتی۔[43] یہ سارے علمی کام رعمسیس فرعون کے دور میں ہوئے جب کہ اس سے پہلے پیپائرس (قدیم مصری کاغذ) کے نسخوں پر شاعری لکھی جاتی تھی۔[44] افناتون فرعون شعر و شاعری کا زبردست دلدادہ تھا کیونکہ وہ قدیم مصر کا پہلا فرعون تھا جس کے بارے

میں کہا جاتا ہے کہ وہ توحید پرست تھا۔اس نے اپنے معبود کے بارے میں والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے متعدد نظمیں اور دعائیں لکھیں۔ اس کی ایک نظم کے اشعار کا ترجمہ کچھ یوں کیا گیا ہے۔

"اس نے ان کے لیے بطور ہتھیار جادو کیا

واقعات کے دھچکا روکنے کے لیے

رات دن ان پر نگاہ رکھنا

اس نے ان میں بد معاشوں کو کچل دیا جیسے آدمی اپنے بھائی کی خاطر اپنے بیٹے کو پیٹتا ہے

خدا ہر نام کو جانتا ہے۔"[45]

3۔4۔2 سائنسی علوم

قدیم مصر کے لوگ ریاضی میں بہت زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ علم ریاضی کی بدولت انہوں نے عظیم الشان اہرام کھڑے کیے جس میں انجینئرنگ اور ریاضی کے اصولوں کا شاندار استعمال کیا گیا تھا۔ان اہراموں کی پیائش اس طرح سے کی گئی تھی کہ آج کے دور جدید میں جدید ترین ٹیکنالوجی سے بھی اس طرح کی پیائش نہیں کی جاسکتی۔ان کی تعمیراتی مہارت کے متعلق ماہرین مصریات لکھتے ہیں کہ

"Egyptians built massive temples, palaces and pyramids without the sophisticated mathematics engineers would use today, since simple arithmetic was all the Egyptians knew. Their expertise extended only to addition and subtraction, not even multiplication or division. Lacking a theoretical understanding of numbers, they substituted clever tricks and found practical ways to arrive at the solutions they needed."[46]

"مصری ریاضی کے ماہر انجینئر کے بغیر بڑے پیمانے پر مندر، محلات اور اہرام تعمیر کرتے تھے کیونکہ وہ ریاضی کے سادہ حساب کتاب کے بارے میں اچھی طرح واقف تھے۔ان کی مہارت صرف جمع تفریق اور ضرب و تقسیم تک محدود نہ تھی۔"

3۔5 قدیم مصر کی عورتیں

قدیم مصری تہذیب میں خواتین کی نہایت آزادانہ حیثیت حاصل تھی اور شاہی خاندان کی عورتوں کو تو لامحدود آزادی حاصل تھی تاہم ان کی آزادی کا دائرہ کار ان کے محلات تک ہی محدود تھا جہاں وہ عام دنیا سے الگ آزادی سے اپنے شوق پورے کیا کرتی تھیں۔[47] یہ خواتین اپنی زیب و زینت کا خاص خیال رکھا کرتی تھیں اور آثار قدیمہ کی دریافتوں میں ان کے بناؤ سنگھار کے بہت سے لوازمات بھی دریافت ہوئے ہیں جن کی مدد سے یہ اپنی خوبصورت کو دیرپا اور برقرار رکھتی تھیں۔[48] ان شاہی خواتین کو دیگر خواتین کی طرح اجازت نہیں تھی کہ وہ تفریحی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔

سورہ یوسف کی روشنی میں مصر کی سماجی حالت

سورہ یوسف میں عزیز مصر کی بیوی اور اس کی سہیلیوں کا واقعہ دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت مصر کے اونچے طبقے کی عورتوں کی اخلاقی اور سماجی کیفیت کس قسم کی تھی۔ عزیز مصر کی بیوی نے دعوت پر جن عورتوں کو بلوایا تھا وہ سب طبقہ اشرافیہ اور امراء کی عورتیں تھیں اور ان عورتوں کو بلوا کر عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسف ؑ کو ان کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان عورتوں کی بھی اخلاقی حالت ایسی ہی تھی جیسی عزیز مصر کی بیگم کی تھی اور وہ عورتیں بھی اپنے گھریلو ملازموں کے ساتھ اسی طرح کے تعلقات میں تھیں جس قسم کے تعلقات کی خواہاں عزیز مصر کی بیوی تھی۔ ان کی اخلاقی سطح اس حد تک گر چکی تھی کہ وہ بھری مجلس میں یہ اعلان کرتی ہے کہ اگر اس نوجوان نے میری خواہش نفس کا سامان فراہم نہیں کیا تو پھر وہ اسے جیل بھجوا کر ہی دم لے گی۔[49] جیسا کہ قرآن پاک میں وارد ہوا ہے کہ

"وَلَقَدْ رَاوَدْتُّه عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُه لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ"[50]

"اور البتہ تحقیق میں نے اس سے دلی خواہش ظاہر کی تھی پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا، اور اگر وہ میرا کہنا نہ مانے گا تو ضرور قید کر دیا جائے گا اور ذلیل ہو کر رہے گا۔"

اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب موقع پر ہی حضرت یوسف ؑ کی بے گناہی ثابت ہو جاتی ہے تو بھی عزیز مصر اپنے بیوی کو کچھ نہیں کہہ سکا اور نہ اس کے خلاف کوئی تادیبی کاروائی کی جب کہ اس عورت نے اپنے اختیارات کے ذریعے ایک معصوم اور بے گناہ کو جیل تک بھیجوا دیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انصاف کی شرائط پوری کیے بغیر ملزم کو ثبوت کے بغیر پکڑ کر جیل میں بھیج دینا بے ایمان حکمرانوں کا پرانا طریقہ ہے اور اس معاملے میں چار ہزار سال پہلے بھی وہی لوگ تھے جو آج ہیں۔[51]

مصر کا طبقہ امراء عام طور پر شہر سے باہر رہا کرتا تھا۔ ان کی بڑی بڑی کوٹھیاں اور محلات ہوا کرتے تھے جن میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے بہت سے دروازے اور کھڑکیاں بھی بنائے جاتے۔ ان محلات کے گرد فصیل اور ارد گرد باغات ہوتے جن میں پھولوں اور پھلوں کے پودے لگائے جاتے۔ یہ طبقہ امراء اپنی عورتوں کے لیے بھی الگ الگ محل تعمیر کرواتے اور جب کبھی یہ اپنی عورت کے پاس ملنے جاتے تو پہلے اسے اطلاع بھجواتے اور جب یہ وہاں پہنچتے تو محلات کے دروازے پر واقع گلزار میں رکتے جہاں سب غلام، کنیزیں اور بیگمات تک حاضر ہو کر ان کے سامنے کورنش بجالاتیں۔ اپنی دعوتوں اور محفلوں میں یہ امیر طبقہ نیم برہنہ خوبصورت لونڈیاں لے کر آتا جب کہ امراء کی عورتیں اپنے ہمراہ نوجوان خوبصورت غلام لاتیں۔ جس امیر زادی کے پاس خوبصورت غلام یا معشوق نہ ہوتا تو اسے بے ذوق سمجھا جاتا تھا۔ ان کی محفلوں اور دعوتوں میں شراب و کباب کی بہتات و فراوانی ہوا کرتی تھی۔ یہ محفلیں نیم برہنہ اور رقص و سرور سے بھرپور ہوتیں۔ ان امیر زادیوں کی خواہش پوری کرنے سے اگر کوئی انکار کرتا تو فی الفور یہ اسے قید خانے میں ڈلوا دیتی تھیں۔[52]

اس ساری صورت حال میں حضرت یوسف ؑ کا عالم بے گناہی میں جیل جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس زمانے کے مصر کی معاشرتی حالت ویسی ہی تھی جیسی قرآن پاک نے بیان فرمائی ہے اور وہاں کے طبقہ امراء و اشرافیہ کی ازدواجی اور معاشرتی زندگی عوام الناس سے یکسر مختلف

تھی۔ان کی عورتیں اعمال و تصرف میں شتر بے مہار کی طرح آزاد تھیں اور مردوں کے دباؤ کو زرا بھی برداشت نہیں کرتی تھیں۔ازدواجی معاملات میں عورتوں کا پلڑا بھاری رہتا تھا اور اخلاقی حیثیت سے یہ معاملہ ایسی صورت حال اختیار کر گیا تھا کہ عصمت و عزت کا معاملہ غیر اہم ہو گیا تھا۔ مصر کے لوگ اپنی عورتوں کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی برداشت کر لیا کرتے تھے۔ دوسری طرف عورتیں بھی مردوں کے معاملے میں شہوت میں غرق تھیں کہ جیسے ہی انہیں پتہ چلا کہ ایک خوب صورت عبرانی غلام پر ایک وزیر کی بیوی مرمٹی ہے تو وہ اس غلام سے ملنے کے لیے بے حد مشتاق ہو گئیں اور اس غلام کو اپنی اداؤں، دل ربائیوں اور شیوہ طرایوں کے تیروں سے چھلنی کرنے کے لیے فوراً عزیز مصر کے گھر پہنچ گئیں۔اس طبقے کی عورتوں کی اس قدر بے باکی اور دلیری اور بغیر کسی جھجھک کے عشق بازی کا اظہار کرنا پورے واقعے کے پس پردہ حقائق کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ شوقین عورتیں اس معاملے میں پوری طرح آزاد تھیں۔[53]

3۔5۔1 زراعت میں خواتین کا کردار

قدیم دور میں مصر کی اکثر آبادی زراعت کے کام سے وابستہ تھی جس میں خواتین بھی اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ اپنا حصہ ڈالا کرتی تھیں۔ مصری خواتین فصلوں کی کٹائی کے وقت کھیت میں کام کرتی تھیں۔ قدیم مصری آرٹ میں ان خواتین کو شراب بناتے، اناج پیستے اور فصلوں میں کام کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔[54] خوراک پیدا کرنا مصر میں زندگی کی بقا کے لیے ایک انتہائی ضروری عمل تھا کیونکہ اگر کسان محنت نہیں کرتے تو مصر کے لوگ بھوکے مر جاتے اور اگر کسان ایک مخصوص مقدار تک غلہ پیدا نہ کر پاتا تو فرعونوں کی طرف سے اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا جس کی وجہ سے خواتین بھی مردوں کے ہمراہ کھیتوں میں کام کیا کرتی تھیں تاکہ فصل کی مطلوبہ مقدار کی پیداوار کو یقینی بنایا جا سکے۔[55] قدیم مصر میں کاہون کا علاقہ زراعت کے حوالے سے خاصی شہرت کا حامل علاقہ تھا جہاں بڑی مقدار میں فصلیں اگائی جاتی تھیں۔ محققین لکھتے ہیں کہ

"Evidence from Kahun indicates that cereal crops were grown in the fields nearby, while vegetables, fruit and flowers were cultivated in the gardens."[56]

"کاہون کے شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اناج کی فصلیں قریب کے کھیتوں میں اگائی جاتی تھیں جب کہ سبزیاں، پھل اور پھول باغوں میں کاشت کیے جاتے تھے۔"

3۔6 عبادت گاہیں

قدیم مصری یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہر ذی روح خواہ زندہ ہو یا مردہ، یہاں تک کہ ان کے دیوی دیوتاؤں کو بھی بنیادی روزمرہ اشیا کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ یہ ایمان رکھتے تھے کہ زندہ انسانوں کی کھانے پینے، تفریح وغیرہ کرنے کی جو ضروریات گھروں میں پوری ہو جاتی ہیں، اسی طرح سے مردہ انسانوں اور دیوتاؤں کو مندروں اور مقبروں میں ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مردوں کو تمام ضروری لوازمات کے ساتھ دفن کیا کرتے تھے جو ان کے عقیدے کے مطابق اس مردے کی آنے والی زندگی میں اس کے کام آنے والے تھے۔[57]

3-6-1 قدیم مصری کاہن

مصر کے قدیم دستاویزی ریکارڈ کے مطابق قدیم دور میں کاہنوں کی مصر میں بہت زیادہ اہمیت اور اثر ورسوخ تھا۔ آثار قدیمہ کی دریافتوں میں جو مندر دریافت ہوئے ہیں ان میں دیوی دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ کاہنوں کے مجسمے بھی موجود ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے معاشرے میں انہیں نہایت ہی وقعت و منزلت حاصل تھی۔[58]

فرعون کو سب سے بڑا کاہن اعظم سمجھا جاتا تھا اور سب سے اہم مذہبی رسم کی ادائیگی صرف فرعون ہی کر سکتا تھا۔ وقت کے ساتھ جب بادشاہ کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں تو بادشاہ نے اپنی معاونت کے لیے دیگر کاہنوں کو اپنی نیابت سونپ دی۔[59] ان کاہنوں کے درجات مختلف تھے اور ہر درجے کے کاہن کی ذمہ داریاں بھی الگ الگ تھیں۔ کچھ کاہنوں کا کام صرف مندروں میں تھا جب کہ کچھ کاہنوں کی ذمہ داریوں میں میت کی تجہیز و تکفین اور آخری رسومات کی ادائیگی شامل تھا۔ کاہن لوگ اس کام کے لیے لوگوں سے اجرت لیا کرتے تھے۔ ابتدائی درجے کے کاہنوں کو واب کہا جاتا تھا جس کا معنی ''پاک آدمی'' کے ہیں۔ یہ کاہن ابتدائی درجے میں رہ کر خوب محنت کرنا جس کے بعد اس کا مرتبہ بڑھا دیا جاتا۔ ایسے کاہنوں کو پہننے کے لیے مخصوص وردی بھی نہیں دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کی ذمہ داریاں مقبروں اور مندروں دونوں جگہ لگائی جاتی تھیں۔ ان کی سب سے اہم ذمہ داری یہ تھی کہ یہ جنازے پر کی جانے والی تمام آخری رسومات کی ادائیگی کرتے تھے جس میں مختلف قسم کے نذرانے چڑھانا بھی شامل تھا۔ انہیں دیگر کاہنوں کی نسبت کم پاک سمجھا جاتا تھا اس لیے انہیں مندر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔[60]

قبر پر ضروری چڑھاوے اور نذرانوں کی وصولی کرنا دوسرے درجے کے کاہن کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی جسے ہیمکا کہا جاتا تھا۔ مرنے والے کے رشتہ داروں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے مردوں پر نذرانے چڑھائیں تاکہ اسے دوسری دنیا میں روحانی سکون میسر ہو سکے۔ ہیمکا درجے کے یہ کاہن لوگوں کے سامنے مخصوص منتر پڑھا کرتے تھے تاکہ انہیں یہ بتا سکیں کہ ان کا چڑھایا ہوا کھانا اس منتر کے توسط سے ان کے مردے تک پہنچ گیا ہے۔[61] پڑھے لکھے کاہنوں کو لیکٹر کاہن کہا جاتا تھا جو مندر میں میت کی آخری رسومات کی ادائیگی کرتے۔ یہ کاہن ایک مخصوص قسم کی وردی پہنتے تھے جسے سیش کہا جاتا تھا۔ یہ وردی ان کے کندے سے شروع ہو کر کولہے پر ختم ہو جاتی تھی۔ مذہبی قواعد و ضوابط کے مطابق صرف شاہی خاندان کے لوگ ہی لیکٹر کاہن بن سکتے تھے مگر بعد میں اس قانون میں تخفیف کر دی گئی اور ہر پڑھا لکھا مصری لیکٹر کاہن بننے لگا۔ لیکٹر سے نچلے درجے کے کاہنوں کو اجازت تھی کہ وہ عوام اور خواص دونوں کے جنازے میں شرکت کر سکتے تھے۔ یہ لوگ بھی ایک مخصوص قسم کی وردی پہنا کرتے تھے۔[62]

قدیم مصر میں زیادہ تر مرد کاہن ہی تمام مذہبی امور سرانجام دیا کرتے تھے تاہم آثار قدیمہ کی دریافتوں کی روشنی میں ماہر مصریات نے یہ راز کھولا ہے کہ بہت سے مندر ایسے بھی تھے جہاں دیوتاؤں کی خدمت کے لیے عورتیں کاہن ہوا کرتی تھیں۔ ان کاہن عورتوں کو امون دیوتا کی روحانی بیویاں کہا جاتا تھا۔[63] قدیم مصر کے حاتور دیوتا، من دیوتا اور فتاح دیوتا کی خدمت گزار بھی یہی عورتیں ہوا کرتی تھیں اور ان کی درجہ

بندیاں بھی اسی طرح سے ہوتی تھیں جس طرح مرد کاہنوں کی ہوتی تھیں۔ یہ کاہن عورتیں ایک مجمع کی شکل اختیار کر کے اپنی دیوی یا دیوتا کے لیے تعریفی کلمات پڑھتیں اور جب کبھی مذہبی جلوس نکلتا تو مردوں کے پیچھے چلا کرتی تھیں۔ ان عورتوں کو امون کے مندر کی گانے والیاں کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سی کاہن عورتیں ایسی بھی تھیں جو اپنے دیوتاؤں کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے اس کے سامنے رقص بھی کیا کرتی تھیں۔[64]

7-3 قدیم مصر اور تجارت

تجارت خواہ مقامی ہو یا بین الاقوامی سطح ہو، مگر یہ ہر عہد میں کسی بھی تہذیب کا ایک اہم ترین ستون رہی ہے۔ ہر علاقے و ملک میں انفرادی، اجتماعی اور قومی سطح پر کچھ نہ کچھ ایسا مال موجود ہوتا ہے کہ اسے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس مال کے ذریعے اپنی تجارت کو فروغ دے۔ قدیم دور میں مصر کا ملک بہت سے قدرتی وسائل سے مالا مال تھا مگر اس کے باوجود یہ اقتصادی لحاظ سے خود کفیل نہیں تھا بلکہ اسے ضروری سامان اور آسائشوں کے لئے تجارت پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ مصر میں تجارتی امور ما قبل تاریخ کے دور سے ہی جاری تھے اور رومی عہد تک مصر میں تجارتی امور بارٹر سسٹم پر چلا کرتے تھے۔ ۵۲۵ قبل مسیح تک مصر پر ہونے والی فارسیوں کے حملے تک یہ سرزمین نقدی نظام (Cash Economy) سے ناآشنا تھی اور تجارت کا فروغ اشیا اور خدمات کے تبادلے سے ہوا کرتا تھا۔ ان اشیاؤں اور خدمات کو ناپنے کے لیے ایک دیبن (deben) نامی اکائی مروج تھی۔ دیبن کا تجارت میں کردار اسی طرح سے ہے جس طرح آج کے دور میں روپے پیسے کا ہے کہ اس کے ذریعے اشیا کی قیمت کو جانچا جاتا ہے تاہم دیبن نام کا کوئی سکہ قدیم مصر میں موجود نہ تھا بلکہ یہ ایک قسم کا پیمانہ تھا۔ ایک دیبن کی مالیت ۹۰ گرام تانبے کی مقدار کے برابر ہوا کرتی تھی جب کہ قیمتی اشیا کے لیے سونے اور چاندی کے دیبن پیمانے مقرر تھے۔ اگر مصر میں بننے والے پیپائرس نامی مخصوص کاغذ کی قیمت ایک دیبن ہوتی اور دوسری طرف جوتوں کی ایک جوڑی کی قیمت ایک دیبن ہوتی تو ان دونوں کو ایک دوسرے کے عوض خرید و فروخت کے لیے استعمال کر لیا جاتا تھا اور اس میں کسی سکے یا نقدی کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح سے اگر ایک دن کام کرنے کا معاوضہ تین شراب کی بوتلوں کی مقدار ہوتا تو پورا دن خدمت لینے کے بعد اس کے عوض مزدور کو تین شراب کی بوتلیں دے دی جاتی تھیں۔[65] مصر میں بارٹر سسٹم کے متعلق محققین لکھتے ہیں کہ

"Egyptians worked for food and goods rather than for money which was unknown until the Ptolemies introduced it during Egypt's final days. Since for most of Egypt's long history no currency existed for exchanging commodities at set values, essential goods were generally manufactured by the user or members of his immediate family: pots, for example, were produced by women in their homes. Commodities, such as bronze plow blades, which could not be made in the average home, were secured, not by purchase from a store, but by barter, which could be a complex procedure involving intricate negotiations."[66]

"مصریوں نے پیسوں کے بجائے کھانے اور سامان کے حصول کے لیے کام کیا۔ بطلیموسی عہد کا پیسے کا نظام مصر میں نامعلوم ہی تھا۔

چونکہ مصر کی بیشتر طویل تاریخ میں اشیائے خورد و نوش کے لیے مقررہ قدروں پر تبادلہ کرنے کے لیے کوئی کرنسی موجود نہ تھی لہذا صاف یا اس کے قریبی خاندان کے لوگ ضروری سامان تیار کیا کرتے تھے مثال کے طور پر خواتین گھروں میں برتن بناتی تھیں۔ پیتل کے ہل چلانے والے تیز دھار آلے چونکہ گھر میں نہیں بنائے جا سکتے تھے لہذا انہیں گھر میں تیار کیے گئے برتنوں کے عوض خرید لیا جاتا تھا جو کہ بارٹر سسٹم کہلاتا ہے۔"

3-7-1 مصر اور بین الاقوامی تجارت

مصر میں پہلے خاندان کی حکومت تک شام، لیبیا اور نیوبیا کے ممالک سے بین الاقوامی تجارت کا آغاز ہو چکا تھا اور کنعان میں مصریوں نے باقاعدہ ایک تجارتی کالونی آباد کر رکھی تھی جب کہ شام اور نوبیا میں بھی ان کے تجارتی مراکز موجود تھے۔ اس عہد میں مصر کے لوگ سرکنڈوں سے بنی کشتیوں کے ذریعے لکڑی کی تجارت کرتے تھے جسے لبنان بھیجا جاتا تھا۔ دوسری طرف دریائے نیل سے بحر احمر تک وادی حمات کا تجارتی راستہ تھا جہاں سامان تجارت کی نقل و حرکت کے لیے گدھوں اور خچروں سے کام لیا جاتا تھا۔[67]

اس عہد کے بازار آج کے بازاروں سے یکسر مختلف تھے۔ تاجر لوگ مختلف گزرگاہوں اور عوامی مقامات پر جا کر اپنے سامان تجارت کا اسٹال لگا لیتے یا پھر گلی محلوں میں پھیری لگا کر سامان فروخت کیا کرتے تھے۔ اکثر تاجر مصر کی بندرگاہوں پر ہی غیر ملکیوں کو اپنا سامان فروخت کر دیا کرتے تھے جب کہ بقیہ آبادی سے سامان کی خرید و فروخت کسی اور طریقے سے کی جاتی تھی۔ سامان کی خرید و فروخت بارٹر سسٹم کے تحت کی جاتی تھی جس میں شے کے بدلے شے کو بیچا جاتا تھا۔[68]

قدیم ایام میں مصر کا سب سے بڑا ذریعہ آمدنی زراعت کا شعبہ تھا جس میں مصر وسیع پیمانے پر فاضل پیداوار اگاتے اور پھر اس اضافی پیداوار کے عوض دیگر ممالک سے معمولات زندگی کی دوسری اشیاء کا حصول کیا جاتا تھا۔ معدنی وسائل کی کمی کی وجہ سے اہل مصر کو بعض مرتبہ دور دراز علاقوں کے لیے بھی سفر کرنا پڑ جاتے تھے کیونکہ مصر میں صرف تانبے کی معمولی مقدار پائی جاتی تھی۔ مغربی ایشیا سے لوہا درآمد کیا جاتا تھا جب کہ مشرقی سوڈان میں کچھ سونے کی کانوں کو بھی دریافت کر لیا گیا تھا۔ تین ہزار قبل مسیح میں بحری جہازوں کی تیاری کے بعد مصریوں نے بحر روم میں واقع جزائر سے بھی تجارتی تعلقات استوار کر لیے تھے یہاں تک کہ مصر کے تاجر جنوبی یورپ کے ساحلوں تک بھی پہنچے ہوئے تھے۔[69]

3-7-2 مصر کا تجارتی سامان

مصر میں مختلف خاندانوں کی حکمرانی کے آغاز سے قبل ہی ہمسایہ ممالک سے تجارتی تعلقات استوار ہو چکے تھے اور مصر میں غیر ملکی سامان ملتا تھا جب کہ مصر کا سامان دیگر ممالک میں جاتا تھا۔ پہلے یہ تجارت سونے اور لوبان کے حصول کے لیے نیوبیا سے کی جاتی تھی بعد میں یہ تجارتی تعلقات وسیع تر ہوتے چلے گئے جس کا اہم ثبوت پہلے خاندان کے فراعین کی تدفین میں ملنے والے کنعانی طرز کے جگ ہیں۔[70] کنعان میں قائم مصری تجارتی مراکز میں مختلف اشیا تیار کروائی جاتیں اور انہیں مصر برآمد کر لیا جاتا۔ دوسرے خاندان کی حکومت تک مصر میں بائبلوس

نامی ایک عمدہ لکڑی کی تجارت بھی شروع ہو گئی تھی کیونکہ یہ لکڑی مصر کی سرزمین پر نہیں پائی جاتی تھی۔ پانچویں خاندان کی حکومت تک تجارتی سامان میں خوشبو دار گوند، ہاتھی دانت، سونے، آبنوس اور مختلف جنگلی جانور بھی شامل ہو گئے تھے جنہیں تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔[71] اناطولیہ سے مصر اضافی تانبا منگواتا تھا کیونکہ کانسی کی تیاری کے لیے اس کی وافر مقدار ناگزیر تھی۔ لیپسلازلی(lapis lazuli) نامی نیلے رنگ کے قیمتی پتھر کو مصر کے لوگ افغانستان سے درآمد کیا کرتے تھے جب کہ بحیرہ روم کے ذریعے یونان سے بھی تجارتی تعلقات قائم تھے اور مصر کے لوگ یونان سے دیگر سامان تجارت کے ساتھ ساتھ زیتون کا تیل بڑی مقدار میں درآمد کیا کرتے تھے۔ اپنے عیش وآرام کے لیے مصریوں نے شیشے اور پتھر کی چیزیں تیار کر کے انہیں تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ سونا، اناج اور پیپرس بھی برآمد کرنے لگے۔[72] اہل مصر پتھر اور لکڑی سے مختلف چیزیں بنا کر دور دراز علاقوں میں تجارت کے لیے بھیجا کرتے تھے۔

"Archaeologists have been able to tell who the Egyptians traded with by looking at their art and architecture. Support beams and large doors made of cedar wood mean there was ongoing trade with Lebanon, which is on the Mediterranean coast more than 200 miles northeast of Egypt. (Lebanon is where cedar trees grow.) Articles of ebony and ivory show that trade with Nubia, in north-central Africa south of Egypt, was well-established. These goods were made by the Nubians or by the peoples of the Sudan and of central Africa. Lapis lazuli (a blue precious stone) ornaments show that Egyptian traders were also benefiting from a long-distance trade network that brought in gemstones."[73]

"ماہرین آثار قدیمہ یہ بتانے میں کامیاب رہے ہیں کہ مصری اپنے فن اور فن تعمیر دیکھ کر کن اقوام کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔ دیودار کی لکڑی سے بنے ہوئے بڑے بڑے شہتیر اور دروازون کا مطلب ہے کہ لبنان کے ساتھ تجارت جاری ہے جو مصر سے ۲۰۰ میل دور شمال مشرق میں بحر روم کے ساحل پر واقع ہے۔ آبنوس کی لکڑی اور ہاتھی دانت کی بنی اشیاء سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے جنوب مشرق میں واقع نیوبیا کے ساتھ تجارت کی جارہی ہے۔ یہ سامان نیوبیا یا سوڈان اور وسطی افریقہ کے عوام نے بنایا تھا۔ لاپسلزولی نامی زیور سے معلوم ہوتا ہے کہ مصری تاجر بھی طویل فاصلے کے تجارتی نیٹ ورک سے فائدہ اٹھا رہے تھے جو قیمتی پتھر لائے تھے۔"

مختلف بیجوں کو نچوڑ کر ان سے تیل حاصل کیا جاتا تھا اور مختلف زینت وآسائش کی چیزیں بنائی جاتیں۔ ۲۵۰۰ قبل مسیح تک مصر کے لوگ ایک مخصوص تھیلی کا استعمال کرتے ہوئے مختلف پھلوں سے عرق نکالا کرتے تھے۔ عموماً یہ طریقہ زیتون کا تیل اور دیگر خوشبو دار تیل نکالنے میں استعمال ہوتا تھا۔ پودوں اور جڑی بوٹیوں کو مصر میں کاشت کیا جاتا تھا جب کہ بہت سی جڑی بوٹیاں افریقہ سے بھی درآمد کی جاتی تھیں۔[74] محنت کش طبقے کے زیادہ تر لوگ زراعت سے وابستہ تھے اور فرعونوں اور جاگیرداروں کی زمینوں میں مزدوری کیا کرتے تھے۔ خوراک کی پیداوار اور کاشت کاری کا عمل مصر اور اہل مصر کی بقا کے لیے ضروری تھا کیونکہ انہی دونوں ذرائع سے اہل مصر اپنی زندگی گزارا کرتے تھے۔[75]

3۔7۔3 تجارتی امور اور انتظامیہ

مصر کے قدیم آرٹ میں فراعین کو عموماً علامتی طور پر زیورات میں ملبوس دکھایا گیا ہے۔ فراعین مصر کے خود مختار بادشاہ تھے اور انہی کو پورے ملکی وسائل اور زمین پر گرفت حاصل ہوا کرتی تھی۔ بادشاہ بیک وقت ملک کا سیاسی اور عسکری رہنما ہوا کرتا تھا اور ملکی امور چلانے کے لیے ایک انتظامیہ تشکیل دیتا تھا جس کے ذریعے ملکی معاملات کو اچھے طریقے سے سرانجام دیا جاتا تھا۔ اس انتظامیہ کا نگران وزیر اعظم ہوتا تھا اور مصر میں فرعون مصر کے بعد دوسرا بڑا انتظامی عہدہ وزیر اعظم کا ہوا کرتا تھا۔ وزیر اعظم سے نیچے مزید وزیر ہوا کرتے تھے جنہیں بادشاہ کا نمائندہ سمجھا جاتا اور ان یہ لوگ حکومتی امور، تعمیراتی کاموں، خزانے، زمینی سروے، قانونی ریکارڈ اور دستاویزی امور کو سنبھالتے تھے۔ علاقائی اعتبار سے مصر کو ۴۲ انتظامی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا جن میں سے ہر حصہ ایک نوم کہلاتا اور اس کے حکمران کو نومارچ کہتے تھے۔ یہ نومارچ صرف وزیر کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے۔ ان کی رسائی مصری معابد اور مندوں تک بھی ہوتی تھی جو مصر کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان مندروں اور عبادت خانوں کو صرف عبادت کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ مصری قوم کا تمام مال و دولت یہی جمع کیا جاتا اور اس کی حفاظت کو یقینی بنایا جاتا۔ ان مندروں اور معابد کے نیچے بڑے بڑے تہ خانوں میں گودام بنائے جاتے تھے جہاں مال و دولت کا یہ خزانہ جمع کیا جاتا تھا جب کہ غلہ اور اناج بھی اسی طرح سے محفوظ کیا جاتا اور وقت پڑنے پر نگران اسے عوام الناس میں تقسیم کرتے۔ اس وقت تک مصری معیشت میں سکے کا نظام شامل نہیں ہوا تھا۔[76] پانچویں صدی قبل مسیح تک جا کر مصر میں سکہ کا نظام متعارف اور مروج ہوا مگر ابتدائی طور پر یہ سکے بھی کسی قیمتی دھات کے ٹکڑے ہوا کرتے تھے۔[77]

3۔8 زراعت

قدیم مصری تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں ایک ساز گار کردار مناسب جغرافیائی خصوصیات کا بھی ہے جس کا سب سے اہم عنصر ہر سال دریائے نیل میں آنے والے سیلاب کی زرخیز مٹی تھی جو مصر کی زرعی زمینوں کو ایک حیات نو بخشا کرتی تھی۔ قدیم مصر کے لوگ اسی وجہ سے وافر مقدار میں خوراک پیدا کرنے کے قابل تھے تاہم اس دور میں مصریوں کو اپنے علاقائی وسائل استعمال کرنے، تکنیکی صلاحیتوں کے اظہار اور فنکارانہ سرگرمیاں کرنے کی بھی حکومت کی طرف سے اجازت حاصل تھی۔ اس دور کے مصر میں زمینوں کا انتظام نہایت اہمیت کا حامل تھا کیونکہ حکومت کی جانب سے لگائے گئے محصولات کا تعین کسی بھی فرد کی زیر ملکیت زمین کی قیمت کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔

مصر میں کاشت کاری کے عمل کا مکمل انحصار دریائے نیل کے پانی پر منحصر تھا اور اگر دریا کا پانی نہ ہوتا تو مصر میں کاشت کاری تو ایک طرف انسانی زندگی کا وجود ہی نہیں ہوتا کیونکہ پانی انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ مصر کے لوگوں نے سال کے تین موسموں کا تعین کر کے خود کو اس میں ڈھال رکھا تھا۔ یہ تین موسم اخیت (سیلاب)، پیریت (پودے لگانا) اور شیمو (فصلوں کی کٹائی) پر مشتمل تھے جب کہ جون سے دریائے نیل میں طغیانی کا عمل شروع ہو جاتا جو بڑھتے بڑھتے سیلابی ریلے کی شکل اختیار کر لیتی اور سیلاب کا یہ موسم ستمبر تک جاری رہتا۔ اس دوران دریائے نیل، اس کے کنارے اور ساحلی علاقے سیلابی پانی میں ڈوبے رہتے اور جب یہ پانی اترتا تو سیلاب میں آئی ہوئی زرخیز مٹی کی

تہ مصر کی زمینوں کو نئی فصلوں کے لیے تحفہ دے جاتی۔ سیلاب کا پانی ختم ہونے کے بعد فصل لگانے کا مرحلہ شروع ہوتا جس کا آغاز اکتوبر سے ہوتا اور فروری تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ کاشت کار اپنی زمینوں میں ہل چلاتے، بیج ڈالتے اور دریا، نہروں اور مختلف گڑھوں میں جمع کیے ہوئے پانی سے ان فصلوں کی آب پاشی کیا کرتے تھے۔ مصر میں بارشوں کا سلسلہ بہت ہی کم ہوا کرتا تھا لہذا فصلوں کو پانی دینے کے لیے تمام مصری کسانوں کا انحصار زیادہ تر دریائے نیل کے پانی پر ہی ہوا کرتا تھا۔[78] مارچ سے مئی تک مصر میں فصلوں کی کٹائی کا موسم ہوا کرتا تھا جس میں تمام کسان اور کاشت کار درانتی لے کر اپنے کھیتوں میں اتر جاتے اور فصلوں کو کاٹتے۔ فصلوں کی کٹائی کے بعد غلے کو تنکے سے الگ کرنے کے لیے ایک مخصوص تکنیک کا استعمال کیا جاتا جسے فلیل کہتے ہیں۔ اس عمل کے ذریعے سے اناج اور بھوسے کو الگ الگ کر دیا جاتا تھا اور پھر اناج کو پیس کر آٹا بنا لیا جاتا۔ آٹا بنانے کے علاوہ مختلف طریقے سے شراب بھی بنائی جاتی تھی جب کہ اس کے بعد جو غلہ بچ جاتا اسے گوداموں میں ذخیرہ کر لیا جاتا تھا تاکہ مناسب وقت پر کام آسکے۔[79]

زمانہ وسطی کے دوران بارہویں خاندان کے دور حکومت میں مصر میں زراعت کے شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی اور یہاں بہت سی نہریں تعمیر کی گئیں۔ نہروں کے لیے علاوہ بڑے حوض اور بند بھی پانی ذخیرہ کرنے کے لیے تعمیر کیے گئے تاکہ سالانہ طغیانی کے وقت زیادہ سے زیادہ پانی کو ذخیرہ کر کے استعمال میں لایا جاسکے۔ اس دور میں آب پاشی کے منصوبوں کو بڑی ترقی ملی اور زراعی نظام بہت بہتر ہوا۔ اس وقت مصر کی زیادہ تر زمینیں فراعین مصر اور امراء کی زیر ملکیت تھیں جب کہ کاشتکاروں کی دو قسمیں تھیں جن میں ایک آزاد جب کہ دوسرے غلام ہوا کرتے تھے۔ آزاد کاشت کاروں کا سامنا ٹیکس وصول کرنے والے حکومتی کارندوں سے ہوتا تھا جو کہ فصل کی تیاری پر اس کا دسواں یا بیسواں حصہ حکومت کو دیا کرتے تھے جب کہ غلام کاشت کاروں کے پاس فرعونوں اور امیروں کی زمینوں پر کام کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔[80]

قدیم مصر کے لوگ گندم کی مختلف اقسام کو اپنی زمینوں میں کاشت کیا کرتے تھے اور فصل اترنے پر ان سبھی کو دو مقاصد کے لیے بڑے پیمانے پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ان میں ایک بڑا مقصد کھانے کے لیے روٹی بنانا جب کہ دوسرا مقصد شراب کی تیاری تھا جس کے لیے غلے کی کثیر مقدار کو صرف کر دیا جاتا تھا۔ فلیکس نامی پودے کو مصری اس کے ثمر آور ہونے سے قبل ہی اکھیڑ لیا کرتے تھے اور ان کے تنوں میں موجود فائبر کے حصول کے لیے انہیں پھر سے اگا دیا جاتا تھا۔ اس کے ریشوں سے لمبے لمبے دھاگے بنائے جاتے جن کا استعمال کپڑے کی چادریں اور دیگر اشیا بنانے کے لیے کیا جاتا۔ پیپرس نامی پودے کی فصل دریائے نیل کے کنارے لگا کرتی تھی اور یہ پورا قدیم دور میں پائیدار اور مضبوط کاغذ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ باغات کے قطعات میں سبزیاں اور پھل اگائے جاتے تھے اور انہیں اگانے کے لیے اس بات کا خاص التزام کیا جاتا کہ زمین اونچی ہونی چاہیے جب کہ انہیں ہاتھ سے ہی پانی دیا جاتا۔ ان سبزیوں میں پیاز، سلاد کے پتے لہسن، دالیں اور خربوزہ شامل تھا جب کہ انگور کی کاشت بھی بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی کیونکہ انگور کو شراب بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔[81]

9-3 جانور اور معاشی امور

اہل مصر کا خیال تھا کہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان ایک متوازن کائنات ربط موجود ہے اور انسان، جانور اور پودے تینوں ایک ہی کل کے

رکن ہیں۔[82] اسی لیے مصر کے لوگ بڑے پیمانے پر جانور پالتے تھے کیونکہ یہ ان کے معاش کا ایک بڑا ذریعہ تھے۔ ان جانوروں میں سب سے اہم ترین مویشی "گائے" تھی جس کی مصر میں بڑی قدر و قیمت تھی۔ انتظامیہ کی جانب سے جب بھی مرد شماری کروائی جاتی تو اس میں انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں پر بھی ٹیکس لگایا جاتا تھا۔ اس ٹیکس کا تعین کسی مصری کے پاس موجود جانوروں کے ریوڑ کی مقدار سے کیا جاتا تھا۔ مویشیوں کے علاوہ مصر کے قدیم لوگ بکروں، بھیڑوں اور سوروں کو بھی پالتے تھے۔ کبوتروں، ہنس، بطخوں اور مرغیوں کو جال ڈال کر پکڑ لیا جاتا اور کھیتوں میں ان کی نسل افزائی کروائی جاتی اور انہیں زبردستی گندھا ہوا آٹا کھلایا جاتا تاکہ وہ فربہ اور موٹے ہو سکیں۔ مصر کو مچھلی فراہم کرنے کا سب سے بڑا اور واحد ذریعہ دریائے نیل تھا جب کہ شہد کی مکھیاں بھی مصر میں پالی جاتی تھیں جن سے شہد اور موم دونوں ہی نکالے جاتے تھے۔[83]

بھاری بوجھ اٹھانے کے لیے قدیم مصر کے لوگ بیلوں اور گدھوں کو استعمال کیا کرتے تھے جب کہ اس کے علاوہ کھیت میں ہل چلانے اور بیج کو مٹی میں ملانے کے لیے بھی ان کا استعمال وسیع پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ مذہبی امور میں نذرانہ کی رسم کے وقت ایک فربہ اور موٹے بیل کا ذبیحہ بھی اچھی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بیل کے علاوہ مصر میں گھوڑوں کا استعمال بھی ہوتا تھا تاہم قدیم مصر میں گھوڑے نہیں ہوا کرتے تھے۔ ان گھوڑوں کو اپنے ہمراہ ہیکسوس لے کر آئے تھے۔ نئی سلطنت کے قیام سے اونٹ بھی مصر پہنچ چکا تھا مگر اسے بار برداری کے کام کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس بات کے بھی شواہد ملتے ہیں کہ مصر میں ہاتھیوں کا بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے مگر ان کا استعمال نہایت ہی قلیل مدت کے لیے ہوا کیونکہ ہاتھیوں کے لیے وسیع و عریض چراہ گاہوں کی عدم موجودگی کے سبب ان کو مصر میں ترک کر دیا گیا۔ عام طور پر گھروں میں جن جانوروں کو پالا جاتا ان میں کتے، بلیاں اور بندر شامل تھے جب کہ افریقی صحرائی شیر اور دیگر غیر ملکی جانوروں کو مصر میں درآمد کیا جاتا تھا۔[84]

10-3 قدیم مصر کے قدرتی وسائل

قدیم مصر ہیرے، یاقوت، سیسے، تانبے، آرائشی پتھروں اور دیگر مختلف قسم کی دھاتوں سے مالا مال ہوا کرتا تھا۔ انہی قدرتی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے قدیم مصریوں نے شاندار مجسمے، یادگاریں، اوزار اور زیورات بنائے۔ اپنے مردوں کو حنوط شدہ لاشوں میں محفوظ کرنے کے لیے مصریوں نے بڑے پیمانے پر نمکیات کا استعمال کیا اور جپسم کا استعمال پلاسٹر بنانے کے لیے کیا۔[85] مصر کے مشرقی صحرا اور وادی سینا میں بہت سی چٹانیں ایسی تھیں جہاں سے وسیع مقدار میں معدنیات کا حصول ممکن بنایا جا سکتا تھا تاہم اس کے لیے حکومتی سرپرستی میسر نہ آ سکی۔ وادی ہمامات میں گرینائٹ اور سونے کی کانیں موجود تھیں جہاں سے سونا نکالا بھی جاتا تھا۔ مصریوں نے سب سے پہلے جس معدنی دولت کو جمع کیا وہ چقمق تھا جس کے ذریعے وہ اوزار تیار کیا کرتے تھے۔ وادی نیل میں ہونے والی کھدائیوں کے نتیجے میں ایک چقمق کی کلہاڑی بھی دریافت ہوئی ہے جو خبر دیتی ہے کہ قدیم مصر کے لوگ اس کا اچھی طرح سے استعمال کیا کرتے تھے۔[86]

11-3 قدیم مصری دور میں انڈسٹریز

قدیم مصر میں کپڑا بنانے کی صنعت کو بہت زیادہ فروغ حاصل تھا اور بہت سے لوگ اس صنعت سے وابستہ تھے۔ کپڑوں کے ساتھ ساتھ بہت

سی ایسی اشیا بھی تیار کی جاتی تھیں جن کو بنانے کے لیے دھاگے کا استعمال ہوتا تھا۔اس صنعت کی وجہ سے بہت سے لوگ سلائی، کتائی، بنائی اور جھال بنانے میں مصروف رہتے تھے۔ کچھ لوگ تھے جو مضبوط ترین دھاگوں کا استعمال کرتے ہوئے پرندے اور مچھلی پکڑنے کے لیے ماہی گیروں کے لیے چھوٹے بڑے جال بھی تیار کیا کرتے تھے۔[87]

کپڑا بافی کے علاوہ تعمیراتی کاموں کے لیے بڑے پیمانے پر ہنر منداور کاریگر موجود تھے جو مدتوں لگا کر یہ ہنر سیکھتے تھے۔[88]تعمیراتی کاموں کے حوالے سے دیرالمدینۃ کے کاریگر بہت شہرت کے حامل تھے کیونکہ انہوں نے مصر میں بڑے بڑے مقبرے اور عمارتیں تعمیر کیں۔ بادشاہوں کی وادی "Kings' Valley" میں بنائے گئے اکثر مقبرے انہی لوگوں نے تیار کیے تھے۔ یہ کاریگر پورا دن میں آٹھ گھنٹے کام کرتے اور دس دن بعد ایک چھٹی کیا کرتے تھے۔ان کا کام کئی کئی ہفتوں تک جاری رہتا یہاں تک کہ یہ اپنی ذمہ داری کو مکمل کر کے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیتے۔[89]

3-11-1 زمین کی ملکیت

قدیم مصر کے قانون میں ممانعت تھی کہ کوئی عام آدمی اپنی زیر ملکیت زمین نہیں رکھ سکتا تھا۔ زمین کی ملکیت کا حق صرف فرعون اور طبقہ امراء کو ہوا کرتا تھا۔اس دور کی اکثر زمین فرعون اور مذہبی کاہنوں کی ملکیت ہوا کرتی تھی جو کسانوں اور کاشت کاروں کو کرایے پر دے دیا کرتے تھے۔ زمین دینے کے عوض کاشت کار اس بات کا پابند ہوتا تھا کہ وہ غلے کی پیداوار کی ایک خاص مقدار زمین کے مالک کو ادا کرے گا جب کہ محصولات کی ادائیگی اس کے علاوہ ہوا کرتی تھی۔[90]

4 قدیم مصر پائیدار ترقی کا شاہکار

جیسا کہ مندرجہ بالا دلائل، تحقیقات و کوائف سے یہ بات واضح ہے کہ قدیم مصر اس دور کی عکاسی کر رہا تھا کہ جس کی تگ و دو میں آج کا انسان لگا ہوا ہے۔ سیاسی نظام میں جو تبدیلیاں اور استحکام اسلام کے آنے کے بعد آیا اس کی نظیر مصری تہذیب میں پھر نہیں ملتی۔ لہذا اگر اہرام مصر کی بات کی جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ ایسا معجزاتی کام اب تک انسانی عقل سے ماورا کارنامہ ہے۔ مثلاً خوفو کا اہرام پایہ تکمیل پہنچنے کے بعد اس عجوبہ عالم پر کاریگروں نے چونے کے پتھروں کی ایک تہ چڑھا دی تھی جس کی چوڑائی ایک سو انچ تھی اور یہ غلاف کا کام دیتی تھی تاہم بعد میں ان غلافی سلوں کو ہٹا دیا گیا جس سے اہرام کا حسن ہی ماند پڑ گیا۔ان سلوں کو اس مہارت سے جوڑا گیا تھا کہ ان کے جوڑوں کا درمیانی خلا ایک انچ کا گیارہ سو پچاسواں حصہ تھا۔اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خوفو کے اہرام میں گلابی پتھر کی چٹانوں کو اس انداز سے جوڑا گیا ہے کہ ان کے جوڑوں کی چوڑائی ایک انچ کے دس ہزارویں حصے کے برابر ہے۔اہرام میں دیوان شاہی تک پہنچنے کے لیے پیچیدہ راستوں کا جال ہے جس میں سے گزر کر اندر اس کمرے تک پہنا جاتا ہے جہاں فرعون کی حنوط شدہ لاش رکھی گئی تھی۔ پتھروں کی بھاری بھر کم عمارت کے اندر واقع اس کمرے میں حیرت انگیز طور پر ہوا کا انتظام موجود ہے اور اس کمرے کی دیواریں گلابی رنگ کے گرینائٹ پتھروں سے بنی ہوئی ہیں۔[91]

اسی طرح قدیم مصر کے لوگوں کو فن مصوری میں حد درجہ مہارت حاصل تھی اور اپنے اس فن کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے ایسی شاہ کار تصاویر بنائی ہیں جو سینکڑوں سال گزرنے کے باوجود آج بھی اسی تاب وتاب کے ساتھ موجود ہیں اور ناظر کو اس گمان میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ گویا انہیں حال ہی میں بنایا گیا ہو باوجود یہ کہ ان کا زمانہ پانچ ہزار قبل مسیح کا ہے۔ یہ تصاویر قدیم مصر کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے لا کر رکھ دیتی ہیں۔ ان میں قدیم مصر کے معاشرے کے ساتھ ساتھ مذہبی اقدار کو بھی واضح اور اجاگر کیا گیا ہے۔ بہت سی تصاویر ایسی ہیں جن میں بادشاہوں کی تعظیم کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مصر کے لوگ مصوری کے ذریعے کسی بھی پیغام کو اس کی اثر انگیزی کے ساتھ منتقل کر دینے کے ماہر تھے۔ انہوں نے اپنے آرٹ میں خوبصورت پودوں اور جانوروں کو نمایاں مقام دیا۔[92] جدید مصر تک آتے آتے مصری آرٹ میں بہت زیادہ تبدیلی و تغیر واقع ہو چکا تھا جس کا اندازہ آثار قدیمہ کی دریافتوں سے ہوتا ہے۔ ان دریافتوں میں مصر کے مختلف شہروں سے دریافت ہونے والے شاہی مقبرے، مقبروں کی دیواریں، اہراموں کی دیواروں، ممیوں کے تابوت شامل ہیں جن پر قدیم مصری مصوروں نے اپنے فن کا شاہ کار مظاہرہ کیا ہے۔[93]

فن مصوری کے ذریعے قدیم مصر کا پورا مذہب آج کی دنیا کے سامنے واضح ہو گیا ہے جس میں بہت سے دیوی دیوتا کی تصویریں شامل ہیں جب کہ لوگوں کو ان کی پرستش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ قدیم دور میں مصوری کا فن پتھروں کو تراش کر کیا جاتا تھا مگر بعد میں انہوں نے مختلف رنگوں کا استعمال بھی شروع کر دیا۔ فن مصوری میں مہارت کے پیچھے بھی مذہب کا عنصر کار فرما تھا کیونکہ وہ اس کے ذریعے بھی اپنی مذہبی ضرورت پوری کیا کرتے تھے۔ مذہبی روایات کے مطابق مردوں کے تابوتوں پر ان کی شکل یا مورت بنانا ضروری تھا تاکہ جب ان کی روح دوبارہ ان میں لوٹے تو وہ تابوت کا چہرہ دیکھ کر اپنے جسم کو پہچان لے وگرنہ وہ روح بھٹکتی پھرے گی۔ ایسی حالت میں کوئی کاریگر اپنے ذہن سے حسن وجمال پر مشتمل مجسمہ تیار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کے ذہن کو مقید رکھا جاتا تھا۔ وہ مجسمے جن پر مصوری کی گئی ہے وہ خوبصورت آدمیوں کے مجسمے ہیں جن پر اعلیٰ آرٹ کندہ ہے جو انہی آدمیوں کی صورت پر مشتمل ہے۔ قدیم مصری عقیدے کے مطابق ایسا ہونا ضروری تھا وگرنہ روح اپنے جسم کو ان مجسموں میں سے شناخت نہیں کر سکتی تھی۔[94]

مصری کاریگری اپنے اس ہنر میں مذہبی روایات اور مذہبی پیشواؤں کے پابند تھے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ مذہبی حدود و قیود کی بہت زیادہ پابندی کرتے تھے۔ مجسمہ سازی کے لیے وہ بہت زیادہ ٹھوس پتھر استعمال کرتے تھے۔ ان کے اوزار نامکمل تھے مگر اس کے باوجود وہ ایسے شاندار کمال کے بت تراش گئے کہ آج کی دنیا ان کی تعریف کرنے پر مجبور ہے۔ مصر کے لوگ دنیا کی تہذیبوں میں پہلے لوگ ہیں جنہوں نے اس صنعت کا باقاعدہ آغاز کیا۔[95]

ساتھ ہی ساتھ ۱۸۶۴ء میں اسکاٹلینڈ سے تعلق رکھنے والے ماہر ریاضی اور ماہر فلکیات اسمتھ پیازی نے مصر کا دورہ کیا اور شیاوپس نامی فرعون کے اہرام کی پیائش کی۔ پیائش کے بعد سمتھ نے ان حقائق کا انکشاف کیا کہ یہ اہرام اپنی چوڑائی کے ہر نو یونٹ کے مقابل دس یونٹ بلند تھا۔ اسمتھ نے اس بلندی کو 10^9 سے ضرب دیا تو اس کا حاصل نو کروڑ اٹھارہ لاکھ چالیس ہزار آیا جو سورج کے گرد زمین کے مدار کا میلوں میں فاصلہ

ہے۔ابتدائی محققین کی دریافتوں کے مطابق یہ اہرام مصر کے عین مرکز میں واقع تھا جسے قدیم دنیا کے مرکز سے بھی قدیم ترین مقام کہا جاتا ہے۔اس اہرام کے دروازوں کی کھڑکیوں کے چوکھٹوں میں پتھر اس قدر مہارت سے لگائے گئے ہیں کہ پچھتر انچ کے بعد ان کی سیدھ میں ایک اونچ کے نوویں حصہ کے برابر فرق آتا ہے۔پتھروں کو اس کمال انداز میں چننا نہایت مہارت کی بات ہے جب کہ آج کے دور کے بڑے بڑے انجینئر اپنے تمام سائنسی آلات کے باوجود ایسی درستگی اور نفاست کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔اس اہرام کی تعمیر میں پائی(Pi)اور جدید ریاضی کے تصورات کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔تاریخ دانون کے مطابق پائی اور ایڈوانس ریاضی کا علم مصر میں اہرام کی تعمیر کے ایک ہزار سال بعد پہنچا ہے۔اہراموں کی تعمیر میں ہمارے سیارے کا محیط، کئی اعشاریہ نیچے تک ایک سال کی پیائش و لمبائی، روشنی کی رفتار، زمین کی کثافت، کشش ثقل کی حالت، اسراع وغیرہ بھی شامل ہے۔ان میں چند پیائشیں تو خلائی پروگرام میں بھی معاون ثابت ہو چکی ہیں۔زمین کے گرد چکر لگانے والے مصنوعی سیاروں نے ثابت کیا ہے کہ ہمارے سیارے زمین کا قطبی نصف قطر ۳۹۴۹ء۸۹ میل ہے اور یہی اعداد و شمار اہرام کی تعمیری پیائش سے بھی مطابقت رکھتے ہیں۔[96]

خوفو کے اہرام میں صرف نوے ملین مکعب فٹ پتھر استعمال ہوا ہے جب کہ اس میں نصب ہونے والے پتھروں کی تعداد تیئس لاکھ ہے جن میں ہر پتھر کا وزن دو سے تین ٹن کے برابر ہے۔جیومیٹری کے حساب سے یہ عظیم اہرام اس قدر زبردست اہرام ہے کہ اس کی بنیاد ایک مکمل مربع ہے جس کے چاروں طرف مساوی مثلثوں کی شکلیں ہیں جو بنیاد سے اوپر اور اندر کی جانب اٹھی ہوئی ہیں۔اس کے اطراف کی ڈھلان ۱۰ سے ۹ کے تناسب سے ۵۱/۱۱۴ء۳ ڈگری پر رکھی گئی ہے۔بلندی پر جا کر یہ اطراف ایک ایسے نقطے پر جا کر مل جاتے ہیں جو بنیاد کے عین مرکز کی سیدھ میں ہے۔اس عظیم اہرام کا ایک امتیاز اس کی بنیاد کے ساکٹ ہیں جو ایسے سوراخوں کا سلسلہ ہے جو بنیاد کی چٹان میں اطراف کے بنیادی پتھروں کو تھامے ہوئے ہیں۔ایک اور حیرت انگیز پہلو سمت بندی(Orientation) ہے جن میں بنیاد کو ٹھیک شمال جنوب مشرق اور مغرب کی سمت میں اس طرح سے رکھا گیا ہے کہ پانچ سیکنڈ کی غلطی بھی نہیں نکالی جاسکتی ہے۔اہرام بنانے والے ماہرین کو شمسی سال کی طوالت سے بھی اچھی طرح واقفیت تھی کہ شمسی سال ۳۶۵دن، ۵ گھنٹے، ۴۸ منٹ اور ۴۹ء۷ سیکنڈ طویل ہوتا ہے۔اعشاری صورت میں لکھا جائے تو اسے ۳۶۵ء۲۴۲۲۴۲ لکھا جاتا ہے۔وہ معمار جس نے اپنی نگرانی میں اس اہرام کا کام مکمل کروایا وہ اس عدد سے اچھی طرح واقف تھا۔بنیاد کی چاروں سمتوں مین سے ہر سمت ۹۱۲۱ء۰۵ اہرامی انچ لمبی ہے۔[97]

آثار قدیمہ کی دریافتوں میں بہت سے ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصر کے لوگ فن طب میں بہت زیادہ ترقی رکھتے تھے۔انہیں بہت سی بیماریوں کا بھی علم تھا اور وہ ان کی علامتیں بھی جانتے اور طریقہ علاج سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔انہوں نے بیماری اور اس کی تشخیص کے بہت سے طریقے دریافت کر رکھے تھے اور ہر بیماری کی ایک سے زائد دوائیاں وہ استعمال کیا کرتے تھے۔حیرت انگیز طور پر ان کے ہر طبّی نسخے میں کسی نہ کسی جانور کا پاخانہ یا پیشاب ضرور شامل ہوتا تھا۔ایسا اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ شاید انہیں مختلف جانوروں کے فضلے کی خاصیتوں کا علم ہو۔موجودہ دور کی ترقی یافتہ میڈیکل سائنس میں بھی بیماری کے علاج کے لیے جانوروں کے فضلوں کا

استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ بیماری کے کیڑوں کو ہلاک کرنے کے لیے جانوروں کا فضلہ اکسیر ثابت ہوتا ہے جیسا کہ ملیریا کے جراثیم ختم کرنے کے لیے کرگدن کا پیشاب بہترین ٹونک ہے اسی طرح سے گوبر کے بھی بہت سے فوائد میڈیکل سائنس بتاتی ہے۔[98]

وہ یہ اعتقاد بھی رکھتے تھے کہ کسی بیماری سے اس وقت تک شفایابی نہیں مل سکتی جب تک کہ دوا کے ساتھ جادو ٹونے کا استعمال نہ کیا جائے چنانچہ ان کے ہر نسخے میں کسی نہ کسی جادو کا منتر ضرور لکھا ہوا ملتا ہے۔ علم تشریح و جراحی میں جو علاج آج مروج ہیں، قدیم مصر کے لوگ پانچ ہزار سال پہلے اس سے نہ صرف واقف تھے بلکہ انہیں کمال حاصل تھا کیونکہ اس قدر زبردست طبّی مہارت کے بغیر ان کے لیے انسانی جسم کو حنوط کر کے محفوظ کرنا ناممکن تھا۔[99]

فراعین مصر کا جب انتقال ہوتا تو ان کی لاشوں کو ایک مخصوص طریقے سے مسالے لگا کر حنوط کر کے محفوظ کر لیا جاتا جس کے بعد ان کی لاشیں ایک طویل مدت تک سالم رہتیں۔ حنوط کے عمل سے گزارنے کے بعد اس لاش کو نہایت ہی تعظیم و تکریم کے ساتھ تابوت میں رکھ کر مقبرے میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ قدیم مصریوں کا ان لوگوں کو محفوظ کرنے کا عمل ممیفکیشن (mummification) کہلاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جسم کو عرصہ دراز تک محفوظ رکھنے کا طریقہ پانچ ہزار پہلے مصر میں رائج تھا جب کہ آج کے جدید دور میں جدید مشینوں کے بغیر جسم انسانی کو محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔[100] ممی بنانے کے لیے جو طریقہ استعمال کیا جاتا تھا، اس بارے میں مورخین لکھتے ہیں کہ

"مردے کے نتھنوں میں چمٹا ڈال کر کئی خاص دواؤں کے ذریعے مغز نکالا جاتا تھا۔ پھر پتھر کے پہلو میں چھید کر کے انتڑیاں وغیرہ باہر نکالی جاتی تھیں اور کھجور کی شراب سے فم معدہ دھویا جاتا تھا پھر پسی ہوئی خوشبودار چیزیں اس پر ڈالی جاتی تھیں۔ ہیر مر اور تیج پات اور اسی قسم کی خوشبودار چیزیں باریک پیس کر پیٹ میں بھر کر اس گھاؤ کو بند کر دیتے تھے پھر لاش کو ستر دن تک سوڈے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ بعد میں اسے نکال کر دھوتے اور اس پر چادر اور پٹیاں لپیٹی جاتیں جن میں گوند لگایا جاتا۔ جو لوگ زیادہ روپیہ خرچ کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے، ان کے مردے کی لاش اس طرز پر بنائی جاتی تھیں کہ انتڑیاں نکالے بغیر ہی دیودار کا تیل پچکاری کے ذریعہ سے فم معدہ کے اندر بھر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد لاش سوڈے میں ڈال دی جاتی تھی۔ عرصہ معینہ کے بعد اسے باہر نکالا جاتا تھا۔ اس اثناء میں تیل کی تاثیر سے انتڑیاں گل کر پانی ہو جاتی تھیں۔ سوڈے کے اثر سے گوت گل جاتا تھا اور فقط ڈھانچہ رہ جاتا تھا جس کو وارث لے جاتے اور تابوت میں ڈال کر دفن کر دیتے تھے۔"[101]

ان ممیوں کو نہایت قیمتی ساز و سامان کے ساتھ دفن کیا جاتا تھا مگر جب قبطیوں کا دور گزر گیا تو مصر پر قابض دیگر اقوام نے یکے بعد دیگر ان اہراموں کو کھود کر یہاں موجود تمام قیمتی اشیا اور خزانہ نکالنا شروع کر دیا اور ہزاروں سال کے اس عمل میں مصر کا پرانا تمام خزانہ چوری ہو گیا۔[102] ایک عرب مؤرخ نے مسلمان خلیفہ مامون الرشید کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ ایک اہرام میں داخل ہوا جس کے مرکزی ہال میں بہت سے آدمیوں کی ممیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں ہر ممی بہت سارے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی اور ہر مردے پر تقریباً سو تھانوں سے زیادہ کفن لپیٹا گیا تھا۔ یہ سب کپڑے درازیِ زمانہ کے سبب سے سڑ کر اپنا رنگ تبدیل کر چکے تھے۔ ان کا رنگ تبدیل ہونے کا ایک سبب ان پر لگے مسالے بھی ہو سکتے ہیں تاہم یہ سب کالے ہو چکے تھے۔ ان مردوں کے جسم آج کے لوگوں کے جسموں کی طرح ہی تھے اور یہ بہت زیادہ لمبے تڑنگے نہیں

تھے۔ان کی لاشوں کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ابھی تک کوئی خرابی نہیں ہوئی ہے بلکہ وہ سب اصل حالت میں موجود ہیں۔ان کے سر کے بال ابھی تک سالم ہیں اور ایک بال بھی سر سے نہیں گرا ہے۔ان لاشوں میں حیرت انگیز طور پر کوئی بھی لاش کسی بوڑھے انسان کی نہیں ہے بلکہ سبھی لوگ جوان ہیں۔ان سبھی لوگوں کے جسم نہایت مضبوط اور طاقتور ہیں۔[103]

5 حضرت یوسفؑ کی معاشی اصلاحات

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے حکمران بننے سے قبل ملک مصر کی ساری زمینیں فرعون اور طبقہ اشرافیہ کے تسلط میں ہوا کرتی تھیں۔رعایا کے لوگ مزدوری کرتے یا پھر کاشت کاری کرتے تھے جنہیں اناج کی صورت میں اجرت روزانہ دے دی جاتی تھی۔اس کے علاوہ تھوڑا بہت کپڑا دے کر ان سے مکانات بنوانے کے لیے بیگار بھی لی جاتی تھی جس کی وجہ سے عوام الناس کی حالت جانوروں کے مثل ہو گئی تھی۔یہ دن رات بیل گدھوں کی طرح کام کیا کرتے تھے۔[104] ان لوگوں کی حالت زار کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے ایک مغربی مصنف لکھتا ہے کہ

"Despite the importance of the farmers' job, they were the poorest paid workers in ancient Egyptian society. Technically they didn't get paid at all! Farmers gave a grain quota to the land owner, with the addition of rent and tax (also paid in grain). Whatever they produced in excess of this they kept or sold. This arrangement worked sufficiently well for the head of a family or head farmer, but field hands were paid a pittance and no doubt couldn't feed their families well or have any excess for purchasing other goods."[105]

"کسانوں کے کام کی اہمیت کے باوجود انہیں قدیم مصری معاشرے میں کم ترین مزدوری دی جاتی تھی۔ تکنیکی طور پر ان کو بالکل بھی ادائیگی نہیں ملتی تھی۔کسان زمین کا کرایہ اور ٹیکس کے علاوہ زمین کے مالک کو اناج کا کوٹہ بھی دیا کرتے تھے۔اس کوٹے کی مقدار اس سے زیادہ ہوتی تھی جو بھی انہوں نے پیدا کیا اور کھایا بیچا۔یہ انتظام ایک خاندان کے سربراہ اور نگہبان کی حیثیت سے ایک کسان کے لیے بہت زیادہ بہتر نہیں تھا کیونکہ محنت مزدوری کی اجرت تھوڑی سی ہی ادا کی جاتی تھی جس میں وہ اپنے کنبے کو اچھا کھانا بھی نہیں مہیا کر سکتے تھے اور نہ ہی دیگر سامان ضرورت خرید سکتے تھے۔"

جب حضرت یوسفؑ نے بادشاہ کو خواب کی تعبیر بتا کر خبر دی کہ مصر پر زبردست قحط آنے والا ہے تو بادشاہ نے حکومت حضرت یوسفؑ کے حوالے کر دی تاکہ اس چیلنج سے نبرآزما ہوا جا سکے۔چنانچہ سیدنا یوسفؑ نے خوش حالی کے سات سالوں میں غریبوں کے ساتھ ساتھ امیروں کو بھی کھیتی باڑی پر لگا دیا۔ان سات سالوں میں کسی کو بھی اجازت نہیں تھی کہ وہ گھر میں بیٹھے کیونکہ زمینیں آباد کروانے کے لیے ہر خطہ زمین کی دیکھ بھال کرنا ضروری تھا۔وہ قطعہ اراضی جو زراعت کے لائق تھے ان پر کاشت کاری شروع کروائی جب کہ بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے کی حکمت عملی تیار کی۔ایسے زمین کے ٹکڑے جہاں خودرو گھاس اُگ آتی ہے،اس گھاس کو کٹوا کر مویشیوں کے چارے کو محفوظ کیا۔[106] حضرت یوسفؑ سے پہلے صرف غریبوں کی عورتیں ہی کھیتوں میں کام کیا کرتی تھیں مگر اب حکومت تبدیل ہونے کے بعد امیروں اور

اشرافیہ کی عورتوں کے لیے کھیت جانے کا حکم آ گیا۔ طبقہ امراء کی یہ عورتیں کھیتوں میں کام کرتیں اور مویشیوں کے چارے کے ساتھ ساتھ اپنے بال بچوں کی دیکھ بھال بھی کرتیں تو ان کی عقل ٹھکانے آ گئی۔ اس دور میں پر تکلف دعوتیں، عیاشیاں اور جشن ختم ہو گئے کیونکہ سیدنا یوسفؑ ہر وقت ان لوگوں کی نگرانی کے لیے موجود تھے۔[107]

جب قحط سالی کے ایام شروع ہوئے تو تب تک تمام اہل مصر کو سرکاری راشن پر زندگی گزارنے کی عادت ہو گئی تھی کیونکہ خوش حالی کے سات سالوں میں سبھی لوگوں کو بلا تفریق راشن حکومت کی جانب سے ملا کرتا تھا مگر اب نیا حکم نامہ جاری ہوا کہ غریبوں کو تو پہلے کی طرح مفت راشن ملتا رہے گا جب کہ دولت مندوں اور اشرافیہ کو راشن خرید کر استعمال کرنا ہو گا۔ چنانچہ امیروں نے راشن کے حصول کے لیے تمام اشیاء یہاں تک کہ آخر میں اپنی زمینیں اور مکانات تک حکومتی تحویل میں دے دیئے۔ اس وقت حضرت یوسفؑ نے اکثر رعایا کو دارالسلطنت میں جمع کر لیا اور امیروں کے محلات میں انہیں ٹھہرایا جب کہ امراء و اشرافیہ کے پاس بھی بقدر ضرورت رہنے کے لیے جگہیں دے دیں۔ ہر سال خشک سالی بڑھتی رہی یہاں تک کہ کنویں میں پانی بھی کم ہو گیا جس کی وجہ سے زراعت بھی نہ ہو سکتی تھی کیونکہ پانی صرف پینے کے لیے ہی بمشکل دستیاب تھا۔ وہ اناج جو خوشوں میں رکھا گیا تھا، اسے جب تقسیم کیا جاتا تو ان بچے ہوئے خوشوں کو بطور چارہ جانوروں کو کھلا دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ وہ ان خوشوں سے جانوروں کا چارہ تیار کریں۔ دوسری طرف طبقہ امراء کا غم و غصہ اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا کیونکہ ان کے گھر اور عزت مسکینوں کے برابر ہو گئے تھے اور انہیں بھی اتنی ہی خوراک ملتی تھی جتنی ایک عام آدمی کو مل رہی تھی۔ جب قحط ختم ہو گیا تو سیدنا یوسفؑ نے تمام زمینوں اور مکانات کی مساویانہ تقسیم کر دی تاکہ سب کی معاشی حالت برابر ہو جائے۔ حضرت یوسفؑ نے ایسے اقدامات کی وجہ سے مصر سے ظالمانہ رسموں اور غریبوں پر ہونے والے ظلم کا خاتمہ ہو گیا۔[108]

6 نتیجہ

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قدیم مصر میں پائیدار ترقی بنیادی طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کی اصلاحات کا نتیجہ تھی، جو الٰہی تعلیمات کی رہنمائی میں، عوامل کا ایک پیچیدہ تعامل پیش کرتی ہے۔ جبکہ قرآنی حکایت پیغمبر کی حکمت اور انتظامی ذہانت کو اجاگر کرتی ہے، مصری تہذیب کے وسیع تناظر پر غور کرنا ضروری ہے۔ مصر کا جغرافیائی فائدہ، جو دریائے نیل کے زرخیز کنارے پر واقع ہے، نے زرعی خوشحالی اور تکنیکی جدت طرازی کی بنیاد فراہم کی۔ صدیوں تک، مصریوں نے آبپاشی اور پانی کے انتظام کے پیچیدہ نظام تیار کیے، جو ماحولیاتی پائیداری کے بارے میں گہری سمجھ کی عکاسی کرتے ہیں۔ مزید برآں، ان کے سماجی ڈھانچے نے، ایک مرکزی حکومت اور نیل کے لیے احترام کے ساتھ، وسائل کے انتظام کے لیے ایک اجتماعی نقطہ نظر کو فروغ دیا۔ اس طرح، جب کہ حضرت یوسف کی قیادت نے بلاشبہ مصر کی ترقی کو تیز کیا، یہ پائیدار طرز عمل کے پہلے سے موجود فریم ورک پر بنایا گیا تھا۔ اس کا کردار اتپریرک تھا، بنیادی نہیں۔ مصر کی تمام پائیدار ترقی کو حضرت یوسف کی اصلاحات سے منسوب کرنا ان سے پہلے کے صدیوں کے علم اور تجربے کو نظر انداز کرنا ہے۔ مصریوں کے فن تعمیر کے کمالات، جیسے اہرام، اور طب اور فلکیات میں ان کی ترقی، ایک ایسی تہذیب کی گواہی دیتی ہے جو اس کے ماحول سے گہرا تعلق رکھتی ہے اور

طویل مدتی منصوبہ بندی کے قابل ہے۔جب کہ حضرت یوسف کی پالیسیاں، جو کہ الہامی حکمت سے متاثر تھیں، بلاشبہ مصر کی خوشحالی میں اہم کردار ادا کرتی تھیں، وہ انسانی فہم وفراست اور موافقت کے ایک بڑے ٹیپسٹری کا حصہ تھیں۔ قدیم مصری معاشرے کی کثیر جہتی نوعیت کو پہچاننا ضروری ہے تاکہ اس کی کامیابیوں کی پیچیدگیوں کی پوری طرح تعریف کی جاسکے۔ مزید برآں، پائیداری کا تصور بذات خود ایک جدید تعمیر ہے، اور اسے قدیم تہذیبوں پر سابقہ طور پر لاگو کرنے کے لیے محتاط غور وفکر کی ضرورت ہے۔ جب کہ مصریوں نے اپنے وسائل کے انتظام میں قابل ذکر دور اندیشی کا مظاہرہ کیا، ان کے طرز عمل بنیادی طور پر مستقبل کی نسلوں کے لیے ماحول کے تحفظ کے لیے شعوری کوشش کے بجائے بقا اور سماجی بہبود کے حصول کے لیے کارفرما تھے۔اس کے باوجود، توازن، ہم آہنگی، اور چکراتی تجدید پر ان کا زور پائیداری کے بہت سے عصری اصولوں کے مطابق ہے۔ایک الہامی رہنما کے طور پر حضرت یوسف کا کردار شک وشبہ سے بالاتر ہے، اور ان کی کہانی حکمرانی اور وسائل کے انتظام میں انمول اسباق پیش کرتی ہے۔تاہم، وسیع تر سیاق وسباق سے اس کی شراکت کو الگ تھلگ کرنے کے لیے ایک پیچیدہ تاریخی بیانیے کو زیادہ آسان بنانے کا خطرہ ہے۔ مصر کی پائیدار ترقی اس کے منفرد جغرافیائی، ثقافتی اور سماجی حالات کے ساتھ ساتھ نسلوں کی مجموعی حکمت کی پیداوار تھی۔ان عوامل کے باہمی تعامل کو تسلیم کرتے ہوئے، ہم اس قابل ذکر تہذیب اور اس کی پائیدار میراث کے بارے میں مزید جامع تفہیم حاصل کر سکتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

[1]Kathleen Kuiper, *Ancient Egypt from Pre-History to Islamic Conquest* (Britannica Educational Publishing, 2011), 9.

[2]جے آر رائے ,قدیم مصر(لاہور: بک فورٹ اینڈ پبلی کیشنز,2014)،ص۷۸.

JR Roy, Ancient Egypt (Lahore: Bookfort and Publications, 2014), p. 78.

[3]David, *The Pyramid Builders of Ancient Egypt*, 1–2.

[4]ہیروڈٹس ,دنیا کی قدیم ترین تاریخ .trans ,یاسر جواد(لاہور: نگارشات پبلشرز,2005)،ص۱۳۷.

Jard Roy, Ancient Egypt (Lahore: Bookfort and Publications, 2014), p. 78.

[5]Kathryn A. Bard and Steven Blake Shubert, *Encyclopedia of the Archaeology of Ancient Egypt* (Taylor & Francis, 2005), 1.

[6]ہیروڈٹس ,دنیا کی قدیم ترین تاریخ،ص۱۳۵.

Herodotus, The Earliest History of the World, p. 135.

[7]سید سراج ,عہد قدیم مشرق ومغرب(کراچی:انٹرنیشنل پریس,1959)،ص۲۶.

Syed Siraj, Ancient East and West (Karachi: International Press, 1959), p.26.

[8]کھوکھر,جہانگیر اردو لغت،ص۱۰۳۶.

Khokhar, Jahangir Urdu Dictionary, p. 1036.

[9]فیروز الدین,فیروز اللغات اردو جامع،ص۹۲۹.

Ferozuddin, Ferozullaghat Urdu Jami, p. 929.

[10]جواد، عالمی انسائیکلوپیڈیا، ص ۱۴۴۷.

Jawad, World Encyclopedia, p. 1447.

[11]Mark, Joshua J.. "**Ancient Egyptian Religion**." *World History Encyclopedia*. Last modified March 14, 2024. https://www.worldhistory.org/Egyptian_Religion/.
[12]Kuiper, *Ancient Egypt from Pre-History to Islamic Conquest*, 10.

[13]ایس ایم شاہد ,تعارف مذاہب عالم) لاہور: ایورنیو بک پیلس (n.d. ،ص ۲۶۲.

SM Shahid, Introduction to Madhhab Alam (Lahore: Evernewbock Palace, n.d.), p. 262.

[14]نظامی ,تاریخِ فرعون، ص ۲۰۲.

Nizami, History of Pharaoh, p. 202.

[15]Bob Brier and Hoyt Hobbs, *Daily Life of the Ancient Egyptians*, 2nd ed. (Westport: Greenwood Publishing, 2008), 7.
[16]Christensen, *Empire of Ancient Egypt*, 38.

رائے ,قدیم مصر، ص ۱۱۴. [17]

Roy, Ancient Egypt, p. 114.
[18]Brier and Hobbs, *Daily Life of the Ancient Egyptians*, 25.

[19]سراج ,عہد قدیم مشرق و مغرب، ص ۹۱.

Siraj, Ancient East and West, p. 91.

[20]Mark, Joshua J.. "Social Structure in Ancient Egypt." World History Encyclopedia. Last modified September 21, 2017. https://www.worldhistory.org/article/1123/social-structure-in-ancient-egypt/.

[21]سراج ,عہد قدیم مشرق و مغرب، ص ۹۱.

Siraj, Ancient East and West, p. 91.

[22]Henry and Museum, *The British Museum Concise Introduction to Ancient Egypt*, 136.
[23]Jules B. Billard, *Ancient Egypt: Discovering Its Splendors* (Washington, DC: National Geographic Society, 1978), 109.

[24]رائے ,قدیم مصر، ص ۱۳۵.

Roy, Ancient Egypt, p. 135.

[25]محولہ بالا، ص ۱۳۶۔

Above, p. 136.

[26]ایضاً

Ibid.
[27]Joyce. Filer, *Disease* (University of Texas Press, 1995), 78–80.
[28]Filer, 25.
[29]Filer, 39.
[30]Strouhal et al., *Life of the Ancient Egyptians*, 250.
[31]Marija Pećanac et al., "Burns Treatment in Ancient Times," *Medicinski Pregled* 66, no. 5–6 (May 2013): 263–67.

[32]رائے ,قدیم مصر، ص ۱۰۵

Roy, Ancient Egypt, p. 105.

[33]Booth, *The Ancient Egyptians for Dummies*, 310.

[34]Christensen, *Empire of Ancient Egypt*, 69.

[35]رائے ,قدیم مصر،ص۱۰-۹.

Roy, Ancient Egypt, p. 9-10.

[36]Booth, *The Ancient Egyptians for Dummies*, 307.

[37]Bard and Shubert, *Encyclopedia of the Archaeology of Ancient Egypt*, 4.

[38]Booth, *The Ancient Egyptians for Dummies*, 35.

[39]Breasted, *Ancient Times: A History of Early World*, 126.

[40]Brier and Hobbs, *Daily Life of the Ancient Egyptians*, 7.

[41]A. Bard Khatryn, *An Introduction to the Archeology of Ancient Egypt*, 2nd ed. (Blackwell Publishing, 2008), 26.

[42]Brier and Hobbs, *Daily Life of the Ancient Egyptians*, 210–11.

[43]Pinch, *A Hand Book of Egyptians Mythology*, 16.

[44]Kuiper, *Ancient Egypt from Pre-History to Islamic Conquest*, 77.

[45]Jan Assmann, *God and Gods* (The University of Washington Press, 2008), 63.

[46]Brier and Hobbs, *Daily Life of the Ancient Egyptians*, 285.

[47]Booth, *The Ancient Egyptians for Dummies*, 44.

[48]David, *The Pyramid Builders of Ancient Egypt*, 158.

[49]مودودی, تفہیم القرآن1991 ,،ج۲،ص۳۹۸-۳۹۷.

Maududi, Understanding the Qur'an, 1991, vol.2, pp. 397-398.

[50]القرآن الکریم، سورۃ یوسف، آیت ۳۲.

Holy Quran, Surah Yusuf, verse 32.

[51]مودودی, تفہیم القرآن1991 ,،ج۲،ص۳۹۹.

Maududi, Understanding the Qur'an, 1991, vol.2, p.399.

[52]اعوان, ''مولانا عبداللہ لغاری اور مولانا عبیداللہ سندھی کی غیر مطبوعہ تفسیر سورۃ یوسف کا تقابلی مطالعہ''،ص۳۱۱-۳۱۰.

Awan, "Comparative Study of Maulana Abdullah Laghari and Maulana Obaidullah Sindhi's Unpublished Tafsir of Surah Yusuf", pp. 310-311.

[53]آزاد, حضرت یوسفؑ،ص۱۲۷-۱۲۳.

Azad, Hazrat Yusuf, pp. 123-127.

[54]Booth, *The Ancient Egyptians for Dummies*, 45.

[55]Booth, 42.

[56]David, *The Pyramid Builders of Ancient Egypt*, 146.

[57]Rosalie David, *Handbook to Life in Ancient Egypt* (New York: Facts on File Inc, 2003), 160.

[58]Emily Teeter, *Religion and Ritual in Ancient Egypt* (New York: Cambridge University Press, 2011), 16.

[59]James, E. Oliver. "priesthood." Encyclopedia Britannica, December 18, 2023. https://www.britannica.com/topic/priesthood.

[60]Teeter, *Religion and Ritual in Ancient Egypt*, 16–21.

[61]Rosemary Clark, *The Sacred Tradition in Ancient Egypt: The Esoteric Wisdom Revealed* (Minnesota: Llewellyn Publications, 2000), 369.

[62]Teeter, *Religion and Ritual in Ancient Egypt*, 21–25.

[63]Patricia Netzley, *The Green Haven Encyclopedia of Ancient Egypt* (Michigan: Green Haven Press,

2003), 311.
[64]Norman Bancroft Hunt, *Living in Ancient Egypt* (New York: Chelsea House, 2009), 79.
65Mark, Joshua J.. "Trade in Ancient Egypt." World History Encyclopedia. Last modified March 14, 2024. https://www.worldhistory.org/article/1079/trade-in-ancient-egypt/.
[66]Brier and Hobbs, *Daily Life of the Ancient Egyptians*, 83.
[67]Mark, Joshua J.. "Trade in Ancient Egypt." World History Encyclopedia. Last modified March 14, 2024. https://www.worldhistory.org/article/1079/trade-in-ancient-egypt/.
[68]Booth, *The Ancient Egyptians for Dummies*, 47.

[69]سراج, عہد قدیم مشرق و مغرب، ص ۷۳.

Siraj, Ancient East and West, p. 73.
[70]Shaw and Nicholson, *The British Museum Dictionary of Ancient Egypt*, 72.
[71]Shaw and Nicholson, 322.
[72]A. (Alfred) Lucas and J. R. (John Richard) Harris, *Ancient Egyptian Materials and Industries.* (E. Arnold, 1962), 13.
[73]Christensen, *Empire of Ancient Egypt*, 26.
[74]David, *The Pyramid Builders of Ancient Egypt*, 158.
[75]Booth, *The Ancient Egyptians for Dummies*, 26.
[76]Lynn. Meskell, *Object Worlds in Ancient Egypt : Material Biographies Past and Present* (Berg, 2004), 23.
[77]F W Walbank et al., "The Cambridge Ancient History, Volume 7, Part 1: The Hellenistic World" VII (1984): 125.
[78]Nicholson and Shaw, *Ancient Egyptian Materials and Technology*, 514.
[79]Nicholson and Shaw, 506.

[80]سراج, عہد قدیم مشرق و مغرب، ص ۷۲-۷۱.

Siraj, Ancient East and West, pp. 71-72.
[81]Nicholson and Shaw, *Ancient Egyptian Materials and Technology*, 577, 630.
[82]Evžen Strouhal et al., *Life of the Ancient Egyptians*, 1989, 117.
[83]Nicholson and Shaw, *Ancient Egyptian Materials and Technology*, 409.
[84]Strouhal et al., *Life of the Ancient Egyptians*, 83–95.
[85]Lucas and Harris, *Ancient Egyptian Materials and Industries.*, 413.
[86]Nicholson and Shaw, *Ancient Egyptian Materials and Technology*, 28.
[87]David, *The Pyramid Builders of Ancient Egypt*, 95.
[88]Christensen, *Empire of Ancient Egypt*, 69.
[89]Booth, *The Ancient Egyptians for Dummies*, 40.
[90]Booth, 26.

[91]اسمتھ, اہرام مصر اور فرعونوں کے عجائبات، ص ۷۱-۶۹.

Smith, The Pyramids of Egypt and the Wonders of the Pharaohs, pp. 69-71.
[92]John A. Wilson, *The Culture of Ancient Egypt* (Chicago: The University of Chicago Press, 1951), 219.
[93]Bard and Shubert, *Encyclopedia of the Archaeology of Ancient Egypt*, 68.

[94]نظامی, تاریخ فرعون، ص ۱۹۶.

Nizami, History of Pharaoh, p. 196.

[95]محولہ بالا، ص ۱۹۷

Al-Mawhabala, p. 197.

[96]اسمتھ, اہرام مصر اور فرعونوں کے عجائبات، ص ۳۶-۳۵.

Smith, The Pyramids of Egypt and the Wonders of the Pharaohs, pp. 35-36.

[97] محولہبالا، ص ۸۲-۸۱

Al-Mahwal Habala, pp. 81-82.

[98] نظامی, تاریخِ فرعون، ص ۱۵۷.

Nizami, History of Pharaoh, p. 157.

[99] ایضاً

Ibid.

[100] رائے ,قدیم مصر، ص ۱۰۴.

Roy, Ancient Egypt, p. 104.

[101] محولہبالا، ص ۱۰۵

Al-Mawhabala, p. 105.

[102] خلدون ,تاریخ ابن خلدون، ج ۱، ص ۳۷۸.

Khaldun, History of Ibn Khaldun, Vol. 1, p. 378.

[103] نظامی, تاریخِ فرعون، ص ۲۴۹.

Nizami, History of Pharaoh, p. 249.

[104] اعوان, ''مولانا عبداللہ لغاری اور مولانا عبیداللہ سندھی کی غیر مطبوعہ تفسیر سورۃ یوسف کا تقابلی مطالعہ''، ص ۵۴۹.

Awan, "Comparative Study of Maulana Abdullah Laghari and Maulana Obaidullah Sindhi's Unpublished Tafsir of Surah Yusuf", p. 549.

[105] Booth, *The Ancient Egyptians for Dummies*, 43.

[106] اعوان, ''مولانا عبداللہ لغاری اور مولانا عبیداللہ سندھی کی غیر مطبوعہ تفسیر سورۃ یوسف کا تقابلی مطالعہ''، ص ۵۴۹، ۵۴۴.

Awan, "Comparative Study of Maulana Abdullah Laghari and Maulana Obaidullah Sindhi's Unpublished Tafsir of Surah Yusuf", pp. 549, 544.

[107] ایضاً

Ibid.

[108] اعوان, ''مولانا عبداللہ لغاری اور مولانا عبیداللہ سندھی کی غیر مطبوعہ تفسیر سورۃ یوسف کا تقابلی مطالعہ''، ص ۵۵۶-۵۵۱.

Awan, "Comparative Study of Maulana Abdullah Laghari and Maulana Ubaidullah Sindhi's Unpublished Tafsir of Surah Yusuf", pp. 551-556.